Regd. L. No.7243 Phone, 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جولائی 1971

المیۂ مشرقی پاکستان کا ذمہ دار کون ہے؟

(اندر ملاحظہ فرمائیے)

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی، گلبرگ ۔ لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

قیمت فی پرچہ
ایک روپیہ

ٹیلی فون
۸۰۸۰۰
خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی گلبرگ لاہور

بدل اشتراک
پاکستان سے
سالانہ ـــــ دس روپے
غیر ممالک سے
سالانہ ـــــ ایک پونڈ

جلد (۲۴) | جولائی ۱۹۷۱ء | نمبر (۷)

فہرست

(۱) لمعات ـــــ ۲
(۲) آشوبِ مشرقی پاکستان کی کہانی ـــــ ۹
(۳) اس کا سہرا بھی فوج ہی کے سر بندھا ـــــ ۲۹
(۴) حقائق و عبر ـــــ (تقسیمِ بنگال) ـــــ (انڈین نیشنلزم کی بنیاد) ـــــ (مسلم قومیت)
ـــــ (اختلافات کیسے رفع ہوں) ـــــ (ہمارا اسلام) ـــــ ۳۲
(۵) ہندو مذہب کیا ہے؟ ـــــ (محترم پرویز صاحب) ـــــ ۴۱
(۶) لوٹ کے واویلا کی حقیقت ـــــ ۶۱

ایڈیٹر محمد خلیل، ناشر سراج الحق، مقام اشاعت ۲۵-بی گلبرگ - لاہور - پرنٹر شیخ محمد اشرف - مطبوعہ اشرف پریس - ایبٹ روڈ - لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

صدر یحییٰ خان نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ملک کے سیاسی مستقبل کے متعلق اپنے پروگرام کا عنقریب اعلان فرمائیں گے۔ جن حالات سے ملک اس وقت دوچار ہے' ان میں اس پروگرام کی جس قدر اہمیت ہو سکتی ہے وہ ظاہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت سارے ملک کی آنکھیں اس اعلان کی طرف لگ رہی ہیں۔ ہم بھی چاہتے تھے کہ وہ اعلان سامنے آجائے تو اس اشاعت میں اس پر تبصرہ کر دیا جائے۔ لیکن ہماری دقت یہ ہے کہ پرچہ کی بروقت اشاعت کے لئے ضروری ہے کہ اس کی کاپیاں کافی دن پہلے پریس میں بھیجی جائیں۔ بنابریں' ہمیں افسوس ہے کہ ہم زیادہ توقف نہیں کر سکتے۔ اگر موعودہ اعلان کے بعد تھوڑی سی بھی گنجائش ہوئی تو ہم زیرِ نظر پرچہ میں اس کا تذکرہ کر دیں گے۔ ورنہ ہماری معذرت قارئین کے سامنے ہے۔

(٭)

سابقہ اشاعت میں ہم نے لکھا تھا کہ جب تک ہم اپنے تعلیمی نصاب میں اس قسم کی انقلابی تبدیلی نہ کریں جس سے نظریۂ پاکستان (ایمان کی حیثیت سے ہمارے نوجوانوں کے دل و دماغ میں راسخ ہو جائے' اس وقت تک ہماری مملکت خطرات سے مامون نہیں قرار پا سکتی ہمیں خوشی ہوئی کہ ملک کے نوجوان طبقہ نے اسے اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ اکثر و بیشتر نے اس سے اتفاق کیا لیکن بعض نے یہ کہا کہ ہم اس باب میں ایمان کی اہمیت کو اور واضح کریں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ہم یہاں جمہوری نظام رائج کرنا چاہتے ہیں' اور جمہوری نظام سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ باہمی مشورہ سے مملکت کے لئے نظام اور پروگرام مرتب کیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ اس میں ایمان کی ضرورت کہاں پڑتی ہے اور اس کا مقام کیا ہے؟ ان نوجوانوں کی طرف سے جو استفسارات ہمیں موصول ہوتے ہیں' ان کا ملخص یہی ہے۔

آپ جو کام بھی کرتے ہیں' اس میں آپ کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ پہلے آپ کے سامنے ایک مقصد آتا ہے' اس کے بعد آپ اس مقصد کے حصول کے لئے عملی پروگرام مرتب کرتے ہیں۔ اس پروگرام میں آپ کا ہر قدم اس مقصد کی طرف اٹھتا ہے۔ اسے "نصب العین" بھی کہتے ہیں۔ یعنی وہ نقطہ جس پر آپ کی نگاہ رکی ہے۔ آپ سفر کے لئے گھر سے نکلتے ہیں تو سب سے پہلے آپ ریلوے اسٹیشن کا رخ کرتے ہیں۔ اس دوران میں "ریلوے اسٹیشن" آپ کا اولین نصب العین ہوتا ہے۔ ٹیکسی منگانا' اس پر سوار ہونا' ڈرائیور کو ہدایت دینا' سارا راستہ دیکھتے جانا کہ ٹیکسی ٹھیک ریلوے اسٹیشن کی طرف جا رہی ہے' اس پروگرام تک پہنچنے کا پہلا نصب العین کہلائے گا۔ ریلوے اسٹیشن پر پہنچنے کے بعد

آپ کا آخری نصب العین وہ شہر ہوگا جہاں آپ نے جانا ہے۔

سمجھنے کی خاطر، آپ "نصب العین" کو ایمان کہہ لیجئے۔ یعنی وہ مقصد جو ہر وقت آپ کی نگاہوں کے سامنے رہے۔ سفر کی مثال انفرادی نصب العین کی تھی۔ اب اجتماعی نصب العین کو لیجئے۔ فٹ بال کی ٹیم گیارہ کھلاڑیوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے سامنے ایک ہی نصب العین ہوتا ہے — یعنی بال کو فریقِ مقابل کے گول میں سے گزار کر کھیل جیت لینا۔ آپ کی کامیابی کا راز اسی میں ہے کہ آپ کی ٹیم کے ہر ممبر کا نصب العین یہی ہو، اور وہ اس نصب العین کے حصول کے لئے انتہائی کوشش کرے۔ اگر ٹیم کے ممبروں کا نصب العین الگ الگ ہو تو اسے آپ ٹیم نہیں کہہ سکتے۔ حتیٰ کہ اگر گیارہ کھلاڑیوں میں سے کسی ایک کا نصب العین بھی مختلف ہو، تو نہ صرف یہ کہ آپ کی کامیابی مشکوک ہو جائے گی، ٹیم میں اس کا وجود سب کے لئے مصیبت کا باعث بن جائے گا۔ ٹیم اسی وقت ٹیم کہلائے گی جب اس میں وحدتِ مقصد ہو، اور ہر کھلاڑی کی کوشش اس مقصد کا حصول۔ اس وحدتِ مقصد کو اس ٹیم کا "ایمان" کہیئے اور اس کے حصول کے لئے جدوجہد کو "اعمالِ صالحہ"

یہ دونوں مثالیں وقتی نصب العین کی ہیں۔ لیکن جب آپ کہتے ہیں کہ "میری زندگی کا مقصد" یہ ہے تو آپ کا وہ نصب العین وقتی یا ہنگامی نہیں ہوتا، مستقل اور غیر متبدل ہوتا ہے۔

آپ کو اس کی مثال شاید ہی کہیں ملے (اور اگر ایسی مثالیں ملیں گی بھی تو شاذ و نادر) کہ کسی شخص نے اپنے لئے آپ کوئی ایسا مقصدِ زندگی متعین کیا ہو، جس میں اسے ساری عمر کسی تبدیلی کی ضرورت نہ محسوس ہوئی ہو۔ انفرادی طور پر تو اس کی کوئی مثال شاید آپ کو مل جائے لیکن قوموں کی زندگی میں ایسی مثال کہیں نہیں ملے گی۔ قوموں کے مقاصد ان کے مصالح کے مطابق صبح و شام بدلتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس قرآن کریم کا دعوےٰ ہے کہ خدا کی طرف سے عطا کردہ مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) انسان کے لئے ایسا نصب العین متعین کرتی ہیں جن میں کبھی کسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ ہر زمانے کے تقاضوں کا نہ صرف ساتھ دیتا ہے بلکہ ان کی امامت (قیادت) کرتا ہے۔

قرآن اس قسم کے نصب العین (یعنی مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے) کو اپنا مقصدِ حیات قرار دینے والوں پر مشتمل ایک جماعت تیار کرتا ہے جسے امتِ مسلمہ یا جماعتِ مومنین کہا جاتا ہے۔ یعنی ایسے افراد پر مشتمل جماعت جو وحدتِ مقصد کی بنا پر ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوں۔ اسے کہا جاتا ہے "ایمان کے اشتراک" کی بنا پر وجود میں آئی ہوئی قوم۔ اور اسی حقیقت کو ان الفاظ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے کہ اسلام میں قومیت کا معیار ایمان کا اشتراک ہے۔ یعنی ایک ایسی ٹیم جس کے ہر ممبر کے سامنے ایک ہی نصب العین ہو۔ اقبالؒ نے اس قرآنی حقیقت کو اپنے الفاظ میں نہایت حسین انداز میں یوں بیان کیا ہے۔

چیست ملت ای کہ گوئی لا الٰہ ۔۔۔ با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ

اے "لا الٰہ الّا اللہ" کے مدعی! کبھی تو نے سوچا بھی ہے کہ ملت کسے کہتے ہیں؟ ہزار ہا آنکھیں ہوں لیکن ان کا نصب العین ایک ہو، تو اسے ملت کہا جاتا ہے۔ اور نصب العین یہ ہو کہ خدا کے سوا اور کسی کو اقتدارِ مطلق حاصل نہیں۔

اہلِ حق را حجت و دعویٰ یکے است ۔۔۔ خیمہ ہائے ما جدا، دلہا یکے است

جو قوم اس طرح (وحدتِ مقصد کی بنا پر) وجود میں آئے ان کا دعویٰ اور مطالبہ بھی ایک ہی ہوتا ہے اور اس دعوے کی تائید میں دلائل بھی یکساں۔ جغرافیائی بُعد ان کی وحدت کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتے کیونکہ ان کے دل ایک ہوتے ہیں۔

ذرہ ہا از یک نگاہی آفتاب　　　یک نگہ شو تا شود حق بے حجاب

ریت کے ذرّوں میں بھی جب یک نگاہی پیدا ہو جائے تو وہ اپنے اجتماعی عمل سے آفتاب درخشندہ بن جاتے ہیں، اور مستور حقیقتیں بے نقاب ہو کر ان کے سامنے آجاتی ہیں۔

یک نگاہی را بچشم کم مبیں　　　از تجلی ہائے توحید است ایں

وحدتِ نصب العین بڑی متاعِ گراں بہا ہے جسے توحید کہا جاتا ہے۔ اس کے جلوؤں کی مظہر وحدتِ مقصد ہوتی ہے۔

ملتے چوں می شود توحید مست　　　قوت و جبروت می آید بدست

جب کوئی قوم وحدتِ مقصد میں والہانہ طور پر جذب ہو جاتی ہے تو اس کی قوتیں لا انتہا ہو جاتی ہیں، اسی بنا پر اقبال نے دوسری جگہ کہا ہے کہ

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملت　　　وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد

یہ ہے ایمان (یعنی وحدتِ مقصدِ حیات) کی اہمیت جسے جمہوریت کہا جاتا ہے۔ قرآن کی رُو سے اس سے مقصود ہوتا ہے ایسا نظام جس میں مستقل اقدارِ خداوندی کو نصب العینِ حیات قرار دینے والوں پر مشتمل قوم، اس نصب العین کے حصول کے طریق، باہمی مشورہ سے طے کرے۔ اس میں جمہوریت ایسے ہوتی ہے جیسے ایک ٹیم کے کھلاڑی باہمی مشورہ سے یہ طے کریں کہ ہمیں بال کو گول تک کس طرح پہنچانا ہے۔

پھر بال کی مثال سامنے آگئی تو آپ آجائیے فٹ بال کے میدان کی طرف جس میں بائیس کھلاڑی لٹھے کو کا کولا پی رہے ہوں۔ ان کا وطن بھی ایک ہے، نسل بھی ایک ہے۔ وہ زبان بھی ایک ہی بولتے ہیں، لیکن وہ ٹیم ایک نہیں۔ دو الگ الگ ٹیمیں ہیں۔ انہیں الگ الگ ٹیموں میں کس بات نے تقسیم کر دیا؟ نصب العین کے اختلاف نے۔ اسے دو قومی نظریہ کہتے ہیں۔

کیا ایسا ممکن ہے کہ آپ ان بائیس کھلاڑیوں کو ایک ٹیم کے افراد تصور کر لیں، یا ان سب کے باہمی مشورہ سے یہ طے کر لیں کہ بال کو کس گول کی طرف لے جانا چاہیئے؟ جس طرح یہ ممکن نہیں، اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ آپ مختلف نصب العین رکھنے والے افراد کو یکجا کر کے ایک قوم متشکل کر لیں، یا ان کے باہمی مشورہ سے اپنا لائحہ عمل مرتب کر لیں۔

قرآن نے جمہوریت (نظامِ شورائیت) کے لئے وحدتِ نصب العین (ایمان) کو بنیادی شرط قرار دیا تھا اور یہ وہ حقیقت ہے جسے تسلیم کرنے پر اب دنیا کی وہ قومیں بھی مجبور ہو رہی ہیں جو قرآن پر ایمان نہیں رکھتیں۔ اٹلی کے مشہور مدبر میزینی کے یہ الفاظ اس سے پہلے بھی ہمارے سامنے آچکے ہیں جن میں اس نے کہا ہے کہ

اس میں شبہ نہیں کہ عام رائے دہندگی کا اصول بہت اچھی چیز ہے۔ یہی وہ قانونی طریق کار ہے جس سے ایک قوم تباہی کے مسلسل خطرات سے محفوظ رہ کر اپنی حکومت آپ قائم رکھ سکتی ہے

لیکن ایک ایسی قوم میں جس میں وحدتِ مقاصد نہ ہو، جمہوریت اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے کہ وہ اکثریت کے مفاد کی نمائندگی کرے اور اقلیت کو مغلوب رکھے۔

جمہوری نظام کے کامیاب ترین اور حسین ہونے کے ثبوت میں بالعموم برطانیہ کو بطور مثال پیش کیا جاتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کا راز کیا ہے (یا کیا تھا ——— کیونکہ اب تو وہاں بھی یہ چیز باقی نہیں رہی)۔ ایک عرصہ ہوا کاؤنٹ ہرمن کیزرلنگ (KEYSERLING) نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا عنوان تھا (IMMORTALITY)۔ کتاب کا موضوع تو کچھ اور تھا (جو اس کے عنوان سے ظاہر ہے) لیکن اس نے اس میں ضمنی طور پر ایک فٹ نوٹ میں لکھا تھا کہ برطانیہ کی سیاسی عظمت کا راز اس میں ہے کہ

وہاں ہر فرد، آزادانہ طور پر وہی کچھ سوچتا ہے جو دوسرے سوچتے ہیں۔ ان سب کا (MIND) ایک ہوتا ہے۔　　(صفحہ ۱۵۹)

یہ ہے جسے اقبال "یک دلی" سے تعبیر کرتا ہے، اور قرآن "الف بین قلوبکم" کہہ کر پکارتا ہے (یعنی خدا نے تمہارے دلوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا)۔ اہلِ برطانیہ نے ایک عارضی مقصد کے لئے اس قسم کی یک دلی پیدا کی تو اس کے خوشگوار نتائج سے عارضی طور پر متمتع ہوگئے۔ قرآن، اس قسم کی ہم آہنگی مستقل طور پر پیدا کرنا چاہتا ہے تاکہ اس کے نتائج ابدی گنار ہوں۔ اس کا نام ہوگا اسلام کا جمہوری (شورائی) نظام۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی ہم مقصدی، یک دلی، ہم آہنگی، محض مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہو جانے یا مسلمانوں جیسا نام رکھ لینے سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ مناسب تعلیم و تربیت ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ مسلمانوں کے گھر تو شیخ مجیب الرحمٰن بھی پیدا ہوا تھا اور جہاں تک نام کا تعلق ہے، اس کے اسلامی ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ اس کے باوجود اس نے (اور اس کے رفقاء نے) اپنی ٹیم کے اندر رہتے ہوئے مخالف ٹیم کے کھلاڑیوں کا رول کیوں اختیار کیا؟ اس لئے کہ ان لوگوں کے دل میں اپنوں کے ساتھ ہم مقصدیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ان کا اسلامی تصورِ پاکستان پر ایمان نہیں تھا۔ یاد رکھیئے! فرد ہو یا افراد کا کوئی گروہ، وہ کسی نظریہ کے خلاف بغاوت اسی وقت اختیار کرتا ہے جب اسے اس نظریہ کی صداقت پر ایمان نہ ہو۔ اور (جیسا کہ ابھی ابھی کہا جا چکا ہے) ایمان پیدا ہوتا ہے صحیح تعلیم و تربیت سے۔ ہمیں تسلیم کرنا چاہیئے کہ یہ ایمان، ہماری جدید نسل میں (بالعموم) موجود نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہم نے ان کی تعلیم و تربیت کا مناسب انتظام نہیں کیا۔ اور اگر ہم نے اس کا اب بھی انتظام نہ کیا تو ہمارے ہاں ایسی نسل کبھی پیدا نہیں ہو سکے گی جس کا نظریۂ پاکستان پر ایمان ہو۔ لہٰذا، موجودہ ہنگامی حالات پر قابو پانے کے بعد، سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہے کہ پاکستان کے تعلیمی نصاب و نظام میں ایسی بنیادی تبدیلی کی جائے جس سے قوم کا نوجوان، ایسی ذہنیت لے کر ابھرے جو نظریۂ پاکستان کے قالب میں ڈھلی ہوئی ہو۔

اور نظریۂ پاکستان اس کے سوا کیا ہے کہ قرآن ہماری زندگی کے لئے واحد، مکمل اور غیر متبدل ضابطہ ہے۔

—————o—————

۲۔ مساوات کی رات

۹ رجون، ۹ بجے شب، جب جمع کرانے والوں نے اپنا آخری روپیہ کل

نوٹ بھی بینکوں یا سرکاری خزانہ میں جمع کرا دیا ' اور جس نے انہیں جمع نہ کرایا ' ان کی حیثیت ردی کے کاغذ سے زیادہ کچھ نہ رہی ' تو ہم نے سوچا کہ جہاں تک نقد دولت کا تعلق ہے ' آج کی رات ' ملک بھر میں ' مساوات کی رات ہے ۔ اس خیال سے ' ایک لمحہ کے لئے ' ہمارے دل میں ایک عجیب سی نورانی چمک پیدا ہوئی جس سے زندگی کی تاریک شب جگمگا اٹھی ۔ اس تصور سے بڑا سکون حاصل ہوا کہ زندگی میں ایک آدھ دن تو ایسا دیکھنے کو ملا جس میں (نقد دولت کے معیار کے مطابق) ۔۔ " شاہ و گدا " برابر ہو گئے ۔۔ (اور شاید گدا ' شاہوں سے نسبتاً زیادہ امیر ہوں کہ ان کے پاس چھوٹے نوٹ زیادہ ہو سکتے ہیں ۔

انسان کی ابتدائی زندگی میں بارٹر سسٹم کا رواج تھا جس میں ضروریات کی چیزوں کا باہمی تبادلہ ہوتا تھا ۔۔ گیہوں والے کو تیل کی ضرورت ہوئی ' اس نے گیہوں دے کر تیل حاصل کر لیا ۔ اللہ اللہ خیر سلا ۔ اس نظام میں نہ اکتناز کا سوال تھا ' نہ احتکار کا ۔ نہ کسی کے پاس زائد از ضرورت " دولت " ہوتی تھی ' نہ وہ اسے خزانوں میں مدفون کر سکتا تھا ۔ اس زمانے میں " دولت " کا وجود ہی نہ تھا ۔

بارٹر سسٹم میں اشیاء کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے میں جو دشواریاں پیش آئیں ' انہیں رفع کرنے کے لئے سکہ ایجاد کیا گیا ۔ سکہ ایجاد تو کیا گیا اس سہولت کی غرض سے ' لیکن یہ بن گیا انسانوں کے لئے جہنم کا طوق ۔ اس سے " دولت " کا وجود ظہور میں آ گیا ' اور امیر اور غریب کا امتیاز شروع ہو گیا ۔ یہی وہ امتیاز ہے جس سے آج حالت یہ ہے کہ

قیامت ہے کہ انسان نوعِ انساں کا شکاری ہے ۔

مصلحین اور مفکرین نے ' دولت کی پیدا کردہ خرابیوں اور تباہیوں کے ازالہ کے لئے بہت کچھ سوچا اور کیا لیکن ہوا یہ کہ ۔۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی ۔۔۔ یہ اس لئے کہ بارٹر سسٹم دوبارہ رائج نہیں ہو سکتا تھا جس سے سکہ کا وجود مٹ جاتا ' اور سکہ کی موجودگی میں امیر اور غریب کا امتیاز ختم نہیں کیا جا سکتا تھا ۔ قرآن آیا اور اس نے اس مشکل ترین مسئلہ کا ایسا پُر سکون اور اطمینان بخش ' کامیاب حل بتایا جس سے سکہ تو باقی رہا لیکن اس کی پیدا کردہ تباہیاں ختم ہو گئیں ۔

اس نے اپنے معاشی نظام کے پروگرام کی ابتدا یہ کہہ کر کی کہ کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ (۵۹/۷) سکہ کی گردش اس طرح کرو کہ وہ تمام معاشرہ میں یوں رواں دواں رہے جیسے جسم کی رگوں میں خون گردش کرتا ہے ۔ ایسا نہ ہو کہ سکہ اوپر کے طبقہ ہی میں گردش کرتا رہے ۔۔ یہ اس کے پروگرام کا قدم اول تھا ۔

پھر اس نے کہا کہ سکہ (دولت) کو منجمد کر کے اسے کسی ایک مقام پر روک رکھنا ' سنگین ترین جرم ہے ۔ اسے دولت کا اکتناز کہتے ہیں جسے آتشِ جہنم کہہ کر پکارا گیا ہے ۔ (۹/۳۴)

پھر اس نے کہا کہ مومن وہ ہیں جو اپنی جان اور " دولت " " خدا کے ہاتھ " بیچ دیتے ہیں اور اس کے بدلے میں خدا انہیں جنت عطا کر دیتا ہے ۔ (۹/۱۱۱) ۔ اس دنیا میں جنت سے مراد ہے ایسا نظام جس میں ' کوئی فرد اپنی ضروریاتِ زندگی (روٹی ' کپڑا ' مکان وغیرہ) سے محروم نہ رہے ۔ (۲۰/۱۱۸)

اس کی عملی شکل یہ تجویز کی گئی کہ جماعتِ مومنین کا ہر فرد اپنی اپنی صلاحیت اور امکان کے مطابق کام کرے ' اور نظامِ معاشرہ اسے اس کی ضمانت دے کہ نَحْنُ نَرْزُقُکُمْ وَ اِیَّاھُمْ (۶/۱۵۲) ۔ ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی ۔ جہاں تک دولت کی شکل میں کمائی کا تعلق ہے ' اس کے لئے تجویز یہ کیا گیا کہ ۔۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۔ قُلِ الْعَفْوَ ۔ (۲/۲۱۹) یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم اس میں سے کس قدر اپنے لئے رکھ لیں اور کس قدر دوسروں کے لئے دے دیں۔ ان سے کہہ دو کہ تمہاری ضروریات سے زائد جس قدر ہے، سب کا سب دوسروں کے لئے دے دو۔ تم نے فالتو سکّوں کو رکھ کر کرنا کیا ہے۔

یوں قرآن کریم نے ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کی جس میں ضروریات ہر ایک کی پوری ہوتی رہیں لیکن فاضلہ دولت کسی کے پاس نہ رہے۔ اور جب فاضلہ دولت ہی نہ رہے تو نہ جائیدادیں کھڑی کرنے کا سوال پیدا ہو، نہ دوسروں کو لوٹنے کھسوٹنے کا امکان باقی۔ یوں قرآن نے 'سکّے' کو باقی رکھتے ہوئے اس کی پیدا کردہ لعنتوں سے انسان کو نجات دلا دی اور صحیح مساواتِ انسانیہ کی طرح ڈال دی۔

یہ تھے وہ خیالات جو ۹ جون کی شب کو ہمارے افقِ ذہنی پر چھا گئے۔ ہم نے سوچا کہ اس وقت 'شب بھر (یا ایک دو دن) کی جو مساوات' ایک ہنگامی ضرورت کے لئے پیدا کی گئی ہے، اگر مملکت میں قرآن کا معاشی نظام رائج ہو جائے، تو یہی عارضی مساوات 'ابد کنار' ہو جائے۔ قرآن کریم نے جو جنت کے متعلق کہا ہے کہ وہ ابدی ہوگی تو اس سے مراد یہ ہے کہ اس دنیا میں جو جنتی معاشرہ قائم ہوگا، اس کی سکون آفرینیاں 'عارضی، ہنگامی اور لمحاتی' نہیں ہونگی۔ وہ ہمیشہ ایسی ہی رہیں گی۔

ایسا ہو جائے تو جنت سے نکلا ہوا آدم، کس سرور و انبساط سے، اپنے فردوسِ گم گشتہ کو پھر سے حاصل کر لے؟

کس قدر سوختہ بخت ہے وہ قوم جسے اس جنت کے حصول کا امکان حاصل ہو لیکن وہ پھر بھی جہنم کے عذاب میں مبتلا رہے۔

(۰)

۲۔ علاج اسکا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی!

پنجاب کے گورنر نے، سرکاری محکموں سے رشوت کی لعنت ختم کرنے کے لئے سخت تاکیدی احکامات نافذ کئے ہیں۔ جن کی رو سے پہلے سے عاید شدہ پابندیوں کی گرہوں کو اور مضبوط کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ رشوت کی لعنت کا احساس اور اسے ختم کرنے کے لئے اقدامات، موجبِ تحسین و ستائش ہیں لیکن ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان اقدامات سے نہ پہلے رشوت ختم ہوئی ہے، نہ اب ہو سکے گی۔ ہوتا یہ ہے کہ ادھر سے اس قسم کے قواعد و ضوابط نافذ ہوتے ہیں، اور ادھر سے ان سے نکلنے کی راہوں کی تلاش اور تراش شروع ہو جاتی ہے، اور یہ لوگ اس میں بالعموم کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ قواعد و ضوابط منضبط کرنے والے دس ذہن ہوتے ہیں تو ان سے نکلنے کے راستے سوچنے والے دماغ ہزاروں کی تعداد میں ——— نیز ان قواعد و ضوابط پر عمل کی نگرانی بھی انہی جیسے انسانوں کے ذریعے کرائی جاتی ہے۔ اس لئے اس قسم کی کوششیں، ہزار نیک نیتی کے باوجود، کبھی ثمر بار نہیں ہوتیں، اور ہر نیا قانون، رشوت کی شرح میں اضافہ کرنے کا موجب بن جاتا ہے۔

رشوت یا اسی قسم کی دیگر خرابیاں، درحقیقت علاماتِ مرض ہیں، علتِ مرض نہیں۔ علتِ مرض وہ غلط معاشی نظام ہے جو اس وقت ہمارے ہاں ہی نہیں، کم و بیش ساری دنیا میں رائج ہے۔ قرآن کریم علاماتِ مرض کا علاج نہیں سوچتا،

علتِ مرض کی بیخ کنی کی تدبیر بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان تمام خرابیوں کی علت اور جڑ ذاتی جائیداد (پرائیویٹ پراپرٹی) کا وجود ہے جس نظام میں 'پرائیویٹ پراپرٹی' کی اجازت ہوگی' اس میں یہ امراض لازماً پیدا ہوں گی۔ ان کا استیصال صرف وہ نظام کرسکے گا جس میں نہ کسی کے پاس زائد از ضرورت دولت ہو' نہ پرائیویٹ پراپرٹی کا امکان یا اجازت۔ لیکن اس کے لئے شرطِ اول یہ ہے کہ ان افراد کی ضروریاتِ زندگی کے پورا کرنے کی ذمہ داری مملکت کے سر پر ہو۔ قرآن کریم اسی قسم کا معاشی نظام تجویز کرتا ہے۔ آپ نے نہیں دیکھا کہ وہ جنت میں ہر قسم کی ضروریاتِ زندگی' اور بلند ترین معیار کی اشیائے آسائش و آرائش وزیبائش کا ذکرِ عام کرتا ہے لیکن کہیں یہ نہیں کہتا کہ ان میں سے کوئی شے کسی کی ذاتی ملکیت ہوگی۔ واضح رہے کہ اشیائے مستعملہ کا کسی کی تحویل میں چلا جانا کہ وہ اس سے متمتع ہو سکے' اور بات ہے' اور پرائیویٹ پراپرٹی اور بات۔ پراپرٹی' زائد از ضرورت املاک کو کہا جاتا ہے۔ لہٰذا 'رشوت' اور اسی قسم کی دیگر تباہیوں کو ختم کرنے کا واحد اور موثر ذریعہ مملکت میں قرآن کے معاشی نظام کا نفاذ ہے اور بس۔

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

لاہور

ہر اتوار ـــــــ ۸ بجے صبح

بمقام

۲۵/بی۔ گلبرگ لاہور

ملتان

بذریعہ ٹیپ

بروز جمعہ ـــــــ بعد نمازِ مغرب

بمقام

شاہ محمد اینڈ سنز۔ بیرون پاک گیٹ

کراچی

ہر اتوار ـــــــ (بذریعہ ٹیپ) ـــــــ ۹½ بجے صبح

(بمقام)

دفتر بزمِ طلوعِ اسلام ۳/۱ فردوس مارکیٹ بالمقابل بس سٹاپ۔ پہلی چورنگی ناظم آباد کراچی ۱۸

آشوبِ مشرقی پاکستان کی کہانی

کچھ اپنوں، اور کچھ غیروں کی زبانی

گذشتہ مارچ - اپریل میں مشرقی پاکستان میں کیا کچھ ہوا، اس کی شدہ شدہ خبریں اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن ایک تو اس طرح کی جستہ جستہ خبروں سے واقعات کا کوئی مربوط نقشہ ذہن پر مرتسم نہیں ہوتا، اور دوسرے اخبارات میں شائع شدہ خبروں کی عمر ایک آدھ دن سے زیادہ نہیں ہوتی۔ مشرقی پاکستان پر جو کچھ گذری ہے، اس کا مملکتِ پاکستان کی تاریخ سے اس قدر گہرا تعلق ہے کہ ایک تو اس امر کی ضرورت ہے کہ اس کا مربوط تصور نگاہوں کے سامنے آ جائے، اور دوسرے یہ کہ وہ تاریخ کے صفحات میں اس طرح محفوظ ہو جائے کہ ہماری آنے والی نسلیں اس سے عبرت حاصل کریں۔ طلوعِ اسلام، تحریکِ پاکستان کا نقیب تھا اور اب سالمیتِ پاکستان کا پیامبر ہے۔ جیسا کہ متعدد بار کہا جا چکا ہے، مملکتِ پاکستان کا وجود، اس کے نزدیک، کوئی سیاسی تقاضا نہیں، یہ اس کے لئے جزوِ ایمان ہے۔ اس لئے کہ اس سرزمین کو دین کی آماجگاہ بننے کے لئے حاصل کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے، تحریکِ پاکستان کے متعلق اصولی اور بنیادی کوائف وحوادث کو اپنی، زمانہ قبل از تقسیم کی اشاعتوں میں محفوظ کر لیا۔ اور تشکیلِ پاکستان کے بعد کے اساسی واقعات اس کے موجودہ دور کے اوراق میں منضبط ہیں۔ اس اعتبار سے بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ جب آنے والا مورخ تحریک و تشکیلِ پاکستان کی تاریخ مرتب کریگا تو طلوعِ اسلام کا محفوظ شدہ مسالہ اس کی عمارت کے لئے بنیادی ہوگا۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر ہماری کوشش ہے کہ المیۂ مشرقی پاکستان کی جس قدر تفاصیل میسر آئیں، انہیں اس کے اوراق میں محفوظ کر لیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس حزنیہ کی مکمل تصویر تو اسی صورت میں سامنے آسکتی ہے جب حکومت کی طرف سے اس کی مستند سرگذشت منصۂ شہود پر آئے۔ یقین معلوم نہیں کہ ایسا ہو سکیگا یا نہیں۔ اور اگر ہو سکیگا تو کب! اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ ہم سے اپنے طور پر جو کچھ ہو سکے اسے منضبط کرنے میں تساہل یا توقف نہ برتیں۔ زیرِ نظر کوائف اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہیں۔ ان میں ایک حصہ تو ان بیانات پر مشتمل ہے جو حکومتِ پاکستان کے ترجمانوں یا خود صدرِ مملکت کے اعلانات کی رو سے سامنے آئے ہیں، اور دوسرا حصہ ہندوستان اور انگلستان کے اخبارات میں شائع شدہ کوائف پر مشتمل ہے۔ اس دوسرے حصہ کے متعلق اتنی وضاحت ضروری ہے کہ ان میں بیان کردہ تفاصیل کے سلسلہ میں وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ سب کی سب مستند ہیں۔ لیکن اس حادثہ کے متعلق اخبار جس نتیجہ پر پہنچے ہیں، وہ بڑا اہم ہے، اور اس کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم نے ان کے بیانات کا شائع کرنا بھی ضروری سمجھا ہے۔ آپ بھی اپنی توجہ ان تفاصیل سے زیادہ ان سے اخذ کردہ نتائج

پر مرکوز کیجیے گا۔ اس سے حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی۔

(۔)

باب اوّل ــــــ اپنوں کی زبانی

۵ مئی کو مرکزی حکومتِ پاکستان کے ایک سرکاری ترجمان نے، ایک مبسوط بیان شائع کیا جو ۶ مئی کے اخبارات میں چھپا۔ (ہمارا ماخذ، پاکستان ٹائمز میں شائع شدہ متن ہے) اس میں مملکتِ پاکستان کی تشکیل اور کالعدم عوامی لیگ کے ماقبل و ماعلیہ کے متعلق شرح و بسط سے گفتگو کرنے کے بعد، یہ بتایا گیا ہے کہ جب صدرِ مملکت نے اسمبلی کے اجلاس کے عارضی التوا کا اعلان کیا تو وہاں پر کیا قیامت ٹوٹ گئی۔ اس بیان کا یہ حصہ درج ذیل ہے:۔

سرکاری ترجمان کا بیان

"اس کے بعد جہنم کے دروازے چوپٹ کھل گئے۔ (بپھرے ہوئے) عوام گلیوں اور بازاروں میں ہجوم کر کے امنڈ آئے اور آتش زنی، قتل و غارت گری، عصمت دری اور لوٹ مار کے ہنگامے عام ہو گئے۔ پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق، ایک جھنڈی دکھائی گئی اور مزدور اور کارکن فیکٹریوں سے باہر آگئے۔ کاروباری ادارے بند ہو گئے۔ اور سرکاری ملازمین دفاتر سے غائب ہونے شروع ہو گئے۔ جو ان ہنگاموں میں رضاکارانہ طور پر حصہ لینے پر آمادہ نہ ہوتے انہیں ڈرا دھمکا کر ایسا کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ ایسے ہی جیسے نازی دہشت پسند کیا کرتے تھے۔ خوف و ہراس اور وحشت و بربریت اس طرح پھیلا دی گئی کہ روزمرہ کی زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی۔ ملک کی آئینی اور قانونی حکومت کے بجائے "سرکاری احکامات" عوامی لیگ کے ہیڈکوارٹر سے جاری ہونے شروع ہو گئے۔ ان احکامات کی رُو سے لوگوں سے کہا گیا کہ وہ سرکاری ٹیکس مت ادا کریں۔ اور جو رقوم وصول ہوئیں انہیں مرکزی حکومت کے بجائے صوبائی حکومت کی مد میں جمع کیا گیا، اور روپیہ حکومت کے خزانہ میں داخل کرنے کے بجائے پرائیویٹ بنکوں میں جمع کرایا گیا۔ یکم مارچ سے ۲۵ مارچ تک، سرکاری نظم و نسق کی مشینری یکسر معطل ہو کر رہ گئی۔ قتل و غارت گری، لوٹ مار، عصمت دری، آتش زنی کی وارداتوں کی اطلاعات صوبے کے طول و عرض سے موصول ہوتی رہیں۔ ڈھاکہ، چٹاگانگ، کھلنا، راج شاہی، سلہٹ اور دیگر متعدد علاقوں میں غاشسٹوں کے سے پاگل پن کے جھکڑ چلنے لگے۔ فوج ملک میں موجود تھی لیکن چونکہ انہیں افرانِ بالا کمانڈ سے سخت تاکید تھی کہ وہ اپنی جگہ خاموش کھڑے رہیں، اس لئے انہوں نے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھایا۔ انہیں یہ حکم اس لئے دیا گیا تھا کہ حکومت چاہتی تھی کہ سیاسی لیڈروں کو موقعہ بہم پہنچایا جائے کہ وہ باہمی افہام و تفہیم سے کسی فیصلہ پر پہنچ جائیں۔ فوج کا ضبط و تحمل قابلِ ستائش تھا۔ انہوں نے قومی جھنڈے کو جلتے ہوئے دیکھا، قائداعظمؒ کی تصویر کو پاؤں تلے روندے جاتے ہوئے دیکھا۔ ان مناظر سے ان کے دل پیچ و تاب کھا رہے تھے اور آنکھیں خون سے سرخ ہو رہی تھیں، لیکن اس پر بھی انہوں نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔"

اس کے بعد اس بیان میں کہا گیا ہے کہ مغربی پاکستان کی اکثریت کی پارٹی کے لیڈر اور خود صدرِ مملکت نے مفاہمت کی انتہائی کوشش کر دیکھی، لیکن بے سود۔ اصل بات یہ تھی کہ عوامی لیگ کے لیڈروں کا اصل منشا کچھ اور تھا اور وہ گفتگوئے مفاہمت میں محض وقت حاصل کرنے کے لئے مصروف تھے۔

"وہ درحقیقت ایک عرصے سے اپنی سازش میں مصروف کار تھے۔ اس سازش کا انکشاف اگرتلہ کیس نے کر دیا تھا لیکن اب وہ کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ ہر ضلع میں "سنگرام پریشاد" کے نقاب میں رضا کاروں کو عسکری تربیت دی جا رہی تھی۔ ہندوستان سے بھاری مقدار میں ہتھیار اور گولہ بارود اسمگل کر کے اسے صوبے کے اہم مراکز میں اکٹھا کر لیا گیا تھا۔ خود ڈھاکہ یونیورسٹی کا جگن ناتھ ہال اس کا اہم مرکز تھا۔ عوامی لیگ کی یہ سازش کس قدر منظم اور پلاننگ کے مطابق تھی، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا تھا کہ (۲۶-۲۵) مارچ کی درمیانی شب کو جگن ناتھ ہال سے مارٹر توپ سے فائر کیا گیا تھا اور تین گھنٹے کے اندر اندر ڈھاکہ کی تمام سڑکوں پر ایسی رکاوٹیں کھڑی کر دی گئیں تھیں (جن سے فوج کی نقل و حرکت کو مسدود کرنا مقصود تھا) عوامی لیگ جن لوگوں کو بات چیت سے اپنے ساتھ ملانے سے قاصر رہی انہیں نازیوں جیسے دہشت خیز حربوں سے اپنی قطار میں کھڑا کر لیا گیا۔ سارے صوبے میں ناقابل فراموش دہشت و بربریت عام کر دی گئی اور ایسے مظالم برپا کئے گئے جن کے تذکرہ سے روح کانپتی ہے۔ اس ہنگامہ آرائی میں عوامی لیگ کے ہاتھوں کس قدر قتل و غارت گری ہوئی اس کا کچھ کچھ اندازہ اب سامنے آنے لگا ہے۔

جو شہادات میسر ہو سکی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عوامی لیگ کا پلان یہ تھا کہ ۲۶ مارچ علی الصبح عام فوجی ہلّہ بول دیا جائے اور بنگلہ دیش کی آزاد حکومت کا اعلان کر دیا جائے۔ اسکیم یہ تھی کہ (سب سے پہلے) چٹاگانگ... اور ڈھاکہ پر قبضہ کر لیا جائے تاکہ مغربی پاکستان سے بحری اور ہوائی فوج کی آمد کا سلسلہ منقطع ہو جائے۔ اس وقت سارے مشرقی پاکستان پر صرف ایک ڈویژن فوج تھی جو (۱۸) بٹالین پر مشتمل تھی۔ ان میں (۱۲) بٹالین مغربی پاکستان کی تھیں جو سارے صوبے، بالخصوص ہندوستان سے ملحقہ سرحدی علاقہ میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اتنی سی فوج کے مد مقابل ہندوستان سے گھس آنے والی فوج، ایسٹ پاکستان رائفلز، اور ایسٹ بنگال رجمنٹ اور دیگر عسکری اداروں کے باغی سب (متحدہ محاذ کی شکل میں) تھے۔ یہ سب مارٹر توپوں، اعلیٰ رائفلوں اور بڑی اور چھوٹی مشین گنوں سے مسلح تھے۔ بعد میں موصول ہونے والی اطلاعات کے مطابق، انہیں ہندوستان سے اسلحہ وغیرہ برابر موصول ہو رہا تھا۔

عوامی لیگ کی طرف سے باقاعدہ عملاً درآزادی کے اعلان میں بس چند گھنٹوں کا وقفہ رہ گیا تھا کہ صدر مملکت نے دانہام و تفہیم سے آخری مایوسی کے بعد) افواج پاکستان کو آگے بڑھنے کا حکم دے دیا۔ وہ نہایت عزم و حوصلہ سے آگے بڑھیں اور بند کے ٹوٹنے سے ذرا ہی پہلے، آگ اور خون کے اس سیلاب کو روکنے میں کامیاب ہو گئیں۔"

اس طرح پاکستان تباہ ہوتے ہوتے بچ گیا —— زندہ باد افواج پاکستان۔

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند!

——— (٥) ———

خود صدر مملکت نے ۲۶ مئی کو ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ

یہ امر اب پایۂ ثبوت تک پہنچ چکا ہے کہ کالعدم عوامی لیگ اور اس کے مؤیدین کی اسکیم یہ تھی کہ چٹاگانگ کی بندرگاہ اور ڈھاکہ کے ہوائی اڈہ پر قبضہ کر کے مجھے (یعنی صدر مملکت) اور میرے رفقاء کو گرفتار کر لیا جائے۔

اس کے بعد انہوں نے کہا کہ

پچیس دن تک ۔ مجیب الرحمٰن نے (مشرقی پاکستان میں) ایک متوازن حکومت قائم کر رکھی تھی۔
اس اجمال کے بعد کسی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ۔

———— (۲) ————

باب دوم ——— غیروں کی زبانی

غیروں میں سرِ فہرست ہندوستان کا نام آتا ہے۔ بنگلور (جنوبی ہند) سے شائع ہونے والے ہفتہ وار جریدہ نشیمن کا ذکر اس سے پہلے ان صفحات میں آچکا ہے۔ اس اخبار نے ہمارے انتخابات پر جو تبصرہ کیا تھا (وہ ۱۱ اپریل ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں) قارئین کے سامنے آچکا ہے۔ اسی اخبار نے اپنی ۱۸ اپریل اور ۹ مئی کی اشاعتوں میں سانحہ مشرقی پاکستان پر بڑی تفصیل سے تبصرے کئے ہیں۔ ہم سے دہرادیا کہ یہ ضروری نہیں کہ ان میں سے ہر تفصیل مستند ہو۔ نہ ہی یہ ضروری ہے کہ ہم اس کی ہر بات سے بھی متفق ہوں۔ ہم ان تبصروں کو یہ دکھلانے کے لئے بھی شائع کر رہے ہیں کہ ان ناشدنی واقعات سے غیروں نے کیا تاثر لیا اور کیا نتائج مستنبط کئے ہیں۔ انہیں غور سے دیکھئے۔

۱- ان تباہیوں کا ذمہ دار کون ہے؟

"نشیمن" نے اپنی ۱۸ اپریل کی اشاعت میں لکھا ہے:-

"ڈھاکہ میں جنرل یحییٰ خان اور شیخ مجیب الرحمان کے درمیان جو آخری گفتگو پاکستان کے سیاسی بحران کو ختم کرنے کے لئے ہوئی اس کی تفصیل اب معلوم ہوئی ہے۔ یہ تفصیل خود عوامی لیگ کے ایک لیڈر نے بتائی ہے اور کہا ہے کہ گفتگو کی ناکامی کی ساری ذمہ داری مجیب الرحمان پر ہے کیونکہ انہوں نے اس صبر، برداشت اور دوراندیشی سے کام نہیں لیا جس کا مظاہرہ جنرل یحییٰ خان کی طرف سے ہوا ہے۔ اس لیڈر کا کہنا ہے کہ آخری دنوں میں گفتگو بہت حد تک نتیجہ خیز ثابت ہو رہی تھی اور قریب تھا کہ تمام صوبوں کو بڑی حد تک آزادی مل جاتی اور جمہوریت بھی قائم ہو جاتی۔ مگر مجیب الرحمٰن نے اس وقت سیاسی حکمت عملی اور عقلمندی سے کام لینے کے بجائے ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لیا۔ اور سارے معاملے کو بگاڑ دیا۔ مجیب کا اندازہ یہ تھا کہ جنرل یحییٰ خان سیاسی بحران سے تنگ آ جائیں گے اور مستعفی ہو جائیں گے۔ اور سارے ملک میں ابتری پھیل جائے گی۔ ایسے وقت میں اگر سرحد کے ولی خان اور بنگال کے عوام بغاوت کر دیں تو تمام معاملہ ختم ہی ہو جائے گا۔ ڈھاکہ میں جو کچھ ہوا وہ خدا کی قدرت کا ایک عجیب و غریب تماشہ تھی۔ کہاں یحییٰ خان مجیب الرحمان کی منت سماجت کرتے تھے اور انہیں سمجھاتے تھے کہ وہ کسی فیصد کو مان لیں اور جس کو بھی مستند کو بیدا نہ کریں۔ عوامی لیگ کے لیڈر نے بتایا ہے کہ یحییٰ خان نے مغربی پاکستان سے عبدالقیوم خان، بھٹو اور مفتی محمود کو خصوصی پیغام بھیجے اور بڑے اصرار کے ساتھ بلایا تھا اور اس میں کوئی سیاست یا چالبازی نہیں تھی۔ اگر وہ چالباز ہوتے تو ڈھاکہ ہی نہ آتے۔ انہوں نے بہت کوشش کی کہ معاملہ بحسن و خوبی تمام ہو جائے اور کسی طرح کی بدمزگی پیدا نہ ہو۔ مگر مجیب نے شروع سے آخر تک معاملہ کو بگاڑا اور اس کے بعد پاکستان میں جو کچھ ہوا اس کی ساری ذمہ داری مجیب پر ہی ہے۔ یحییٰ خان کو اس کا ذمہ دار ہرگز ہرگز نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اس کے دلائل خود عوامی لیگ کے لیڈر نے یوں دیئے ہیں۔

گفتگو کی تفصیل ——— جنرل یحییٰ خان ڈھاکہ پہنچے تو اپنے ساتھ تین تجاویز لائے تھے جنہیں انہوں نے ایک کے

بعد ازاں ۔۔ ۱۰ دن تک گفتگو کے مختلف مرحلوں میں پیش کیا۔ ان کی پہلی تجویز تھی کہ صوبوں کو فوراً اقتدار منتقل کر دیا جائے گا اور صوبائی حکومتیں بنا دی جائیں گی اور دستور کے تیار ہونے تک ایک نگران حکومت مرکز میں کام کرے گی۔ اور اس کی ایک مشاورتی مجلس ہوگی جس میں ان تمام پارٹیوں کے نمائندے ہونگے جو قومی اسمبلی میں منتخب ہو کر آئے ہیں۔ اس مجلس میں پارٹیوں کی اکثریت کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے گا۔ ان کی دوسری تجویز تھی کہ مرکز میں ایک عارضی حکومت فوراً قائم کی جائے گی اور یہی حکومت ملک کا پورا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لے گی۔ صوبائی حکومتیں بنائی نہیں جائیں گی۔ اُن کی تیسری تجویز تھی کہ اگر سیاسی لیڈر آپس میں کوئی تصفیہ کر لیں اور یہ اعلان کر دیں کہ مرکزی حکومت کی تشکیل فلاں فلاں طریقے پر ہوگی اور دستور کی بنیاد فلاں فلاں اصولوں پر کی جائے گی تو اقتدار فوراً منتقل کر دیا جائے گا۔ ان تجاویز میں نہ تو کوئی قانونی الجھن تھی اور نہ کوئی پیچیدگی تھی۔ اس میں سے پہلی تجویز تو بہت ہی اچھی تھی۔ کیا اچھا ہوتا کہ اس کو مان لیا جاتا اور جمہوریت کی فوراً بحالی کی کوشش کی جاتی۔ مگر مجیب الرحمان کا حال تو اُس بھوکے کا تھا جو ایک ہی نوالے میں تمام کھانا کھا جانا چاہتا تھا۔ اس نے ہر تجویز کو ٹھکرا دیا اور اپنی طاقت کو منوانے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں انسان موت کے بھیانک غار میں گر پڑے اور مشرقی پاکستان ایسا تباہ و برباد ہوا کہ شاید اُس کو پھر اگلی حالت پر لانے کے لئے ۲۰ سال سے بھی زیادہ کا عرصہ لگ جائے۔ اب مذکورہ بالا تجاویز پر کیا گفتگو ہوئی اور اس کا انجام کیا ہوا، اس کی تفصیل بھی ملاحظہ فرمایئے۔

یحییٰ خان کی نیک نیتی

صدر یحییٰ خان کے لئے سب سے بڑی مشکل یہی تھی کہ وہ قومی اسمبلی کا اجلاس بلا نہیں سکتے تھے کیونکہ بھٹو ایسے کسی اجلاس میں شریک ہونے کے لئے تیار نہیں تھے جس میں صرف مجیب الرحمٰن کی بات چلے اور دوسروں کی کسی بھی تجویز کو وہ ٹھکراتے چلے جائیں۔ اُدھر مجیب الرحمٰن کسی بھی قیمت پر اپنے چھ نکات میں سے کسی قسم کی ترمیم کرنے پر تیار نہیں تھے۔ چنانچہ یحییٰ خان نے قومی اسمبلی کے اجلاس کا معاملہ ہی ترک کر دیا۔ اور بات چیت انہوں نے دستور کی تیاری سے نہیں بلکہ اقتدار کی منتقلی سے شروع کی۔ یہ ان کی نیک نیتی ہی کی دلیل تھی۔ اور مجیب الرحمٰن خود اس بات کے قائل تھے کہ یحییٰ خان بہت تبدیل ہو کر آئے ہیں اور ان کی بات چیت کا انداز بدلا ہوا ہے۔ دستور کا نام بھی یحییٰ خان نے اپنی گیارہ روزہ گفتگو میں نہیں لیا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ایسا دستور جس میں صرف مشرقی پاکستان کا ذکر ہو، مغربی پاکستان والے ہرگز منظور نہیں کریں گے اور ایسے دستور کی منظوری صدر کبھی نہیں دے سکتا۔ کیونکہ یہ اعلان ہو چکا تھا کہ پاکستان کا دستور ایسا ہونا چاہیئے جو دونوں صوبوں کے لوگوں کو پسند ہو۔ چنانچہ سب سے پہلی تجویز صوبوں کو اقتدار بحال کرنے اور مرکز میں نگران حکومت قائم کرنے کی تھی۔ مجیب الرحمان نے کہا کہ میری پارٹی کو ہر طرح سے اکثریت حاصل ہے اور میں اکثریتی پارٹی کا لیڈر ہوں۔ لہذا نگران حکومت میں ہی بناؤں گا اور میرے حسب منشاء وزیر ہوں گے۔ بھٹو نے کہا کہ ایسی حکومت جس میں کوئی لچک نہیں ہوگی اور جس کو لوگ صرف مشرقی پاکستان کی حکومت کا نام دیں گے، مغرب میں عوام کی قبولیت حاصل کرنے میں ناکام ہو جائے گی اور ایسی حکومت کو عوامی تعاون بھی حاصل نہیں ہوگا۔ لہذا یہ چیز ملک کے مفادات کے حق میں بہتر نہیں ہوگی۔ بھٹو نے کہا کہ دستور کی تدوین کا جہاں تک تعلق ہے اُس کا حال بھی بالکل ایسا ہی ہے۔ جب مجیب الرحمٰن کسی کی بات سنتے ہی نہیں اور کوئی ترمیم قبول کرتے ہی نہیں تو پھر دستور بنے گا کیسا اور اس کو پسند کریں گے کیسے۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ دوسری کسی تجویز پر غور کیا جائے۔ تو یحییٰ خان نے کہا کہ

عارضی انتظامی حکومت مرکز میں بنا دی جائے۔ اس تجویز کو مجیب اور بھٹو دونوں نے قبول نہیں کیا، تو یحییٰ خان نے تیسری تجویز پیش کی کہ تم سب مل کر کسی فیصلے پر پہنچ جاؤ اور میں اسی وقت اور اسی جگہ اقتدار منتقل کر دینے کا اعلان کر دوں گا۔ یحییٰ خان نے اس موقع پر بڑی رقت انگیز تقریر کی اور کہا کہ ایک ماہ سے مشرقی پاکستان کے حالات خراب ہیں۔ پیداوار بہت کم ہے۔ لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ بہت سنگین بن گیا ہے۔ عوام قانون کا احترام بھول گئے ہیں۔ پاکستان دیوالیہ ہونے کے قریب ہے۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ تم سب سر جوڑ کر بیٹھو اور ملک کو بچانے کی کوئی تجویز سوچو۔ یہ وقت آپس میں لڑنے اور تباہی کو دعوت دینے کا نہیں، غیر یقینی اور خطرناک حالات کو ختم کرنے کا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مرکز میں تمام پارٹیوں کی ایک حکومت بناؤں گا اور میں ہی صدر رہوں گا۔ تم لوگ صوبوں کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لو۔ چند دنوں کے بعد قومی اسمبلی کا اجلاس بلا کر دستور کی تیاری شروع کرو۔ تو مجیب الرحمٰن نے تجویز پیش کی کہ یحییٰ خان فوراً مارشل لاء اٹھا لیں۔ اور اعلان کر دیں کہ صوبوں کا سیاسی اقتدار دے دیا گیا ہے۔ اس کے بدلے میں مجیب اور ان کی پارٹی یحییٰ خان کو پاکستان کا عارضی صدر تسلیم کر لیں گے اور انہیں ملک کا انتظام چلانے کی اجازت دے دیں گے۔ اس موقع پر بھٹو کی ہوشیاری اور چالاکی کام آگئی۔ وہ تھوڑی دیر تک خاموش بیٹھے دیکھتے رہے کہ یحییٰ خان اس کا کیا جواب دیتے ہیں .... انہیں یہ تجویز پسند آگئی۔ قریب تھا کہ وہ اسے تسلیم کر لیتے، مگر بھٹو نے سب سے پوچھا کہ مجیب الرحمٰن کی تجویز تو بڑی اچھی ہے مگر ایک چیز غور کرنے کی یہ ہے کہ جب مارشل لاء اٹھا لینے اور صوبوں کو سیاسی اقتدار دینے کا اعلان یحییٰ خان کر دیں تو پھر مجھے بتلائیے کہ وہ آخر کس قانون کے تحت پاکستان کے صدر باقی رہیں گے اور مرکز میں کس کی حکومت رہے گی۔ یحییٰ خان آج صدر ہیں تو صرف اس قانون کے تحت کہ وہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہیں۔ اگر مارشل لاء ہی نہیں رہے تو پھر یحییٰ خان کہاں رہیں گے۔ پاکستان بھی کہاں رہے گا۔ بھٹو نے یہ بھی کہا کہ اگر صوبوں کو آزاد کر دیا گیا اور مرکزی حکومت مضبوط نہیں رہی تو پاکستان پانچ بااختیار صوبوں میں بٹ جائے گا۔ بھٹو کا یہ کہنا تھا کہ صدر یحییٰ خان...... نے سارے معاملے کی نوعیت سمجھ لی۔ چونکہ گفتگو فیصلہ کن مرحلہ میں پہنچ چکی تھی اس لئے صدر یحییٰ خان نے اس میں رکاوٹ ڈالنے یا اس کو ختم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے (بھٹو نے) فوراً کہا کہ سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ قومی اسمبلی کا ایک مختصر سا اجلاس بلایا جائے اور اس میں مرکزی حکومت کی تشکیل کے ساتھ عارضی صدر کا اعلان کر دیا جائے۔ اس کے عوض یحییٰ خان نے یقین دلایا کہ وہ مارشل لاء فوراً اٹھا دیں گے۔ مجیب نے کہا کہ یہ بھٹو کا بچھایا ہوا نیا جال ہے، لہٰذا وہ قومی اسمبلی کے اجلاس میں صدر مملکت کے تقرر کی تجویز ہرگز قبول نہیں کریں گے۔ یہ بات مجیب الرحمان نے اس لئے کہی کیونکہ ان کے دل میں یہ بدگمانی پیدا ہو گئی تھی کہ بھٹو اور یحییٰ دونوں خفیہ معاہدہ کر کے ڈھاکہ آئے ہیں اور کسی نہ کسی طرح انہیں پھانسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یحییٰ خان نے مجیب کی اس بدگمانی کو تاڑ لیا اور فوراً کہا کہ صدر مملکت کسی بھی غیر جانبدار شخص کو بنا دیا جائے۔ اور وہ صدارتی عہدے کے لئے بالکل کھڑے نہیں ہوں گے۔ یحییٰ خان کی اس یقین دہانی کا اثر بھی مجیب کے دل پر نہیں ہوا۔ انہوں نے کہا کہ جب تک مارشل لاء اٹھایا نہیں جاتا اور اس کا اعلان ریڈیو اور اخبارات کے ذریعے نہیں کیا جاتا اس وقت تک وہ کسی بھی تجویز کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یحییٰ خان نے مجیب سے کہا کہ وہ ایک مرتبہ پھر اس آخری تجویز پر غور کر لیں کیونکہ اس سے بہتر تجویز نہیں ہو سکتی۔ یحییٰ خان نے نہ صرف یہ کہ مجیب کو سمجھایا بلکہ ان کے تمام ساتھیوں کو بھی جو بات چیت کے وقت موجود رہتے تھے الگ الگ سمجھایا اور پھر خان ولی خان کو خصوصی طور پر ان کے پاس روانہ کیا۔ مگر تمام ہی کوششوں میں وہ ناکام ہو گئے۔ چونکہ مجیب الرحمٰن کا عندیہ معلوم ہو چکا تھا اور صدر کو یقین تھا کہ اب بات چیت

آگے نہیں بڑھے گی تو انہوں نے جنرل ٹکا خان سے بات چیت کی اور انہیں فوجی کارروائی کا تمام پروگرام سمجھا دیا۔ پھر تیاریاں شروع ہو گئیں۔ فوجوں کو راتوں رات اہم مقامات پر اور اہم شہروں پر روانہ کر دیا گیا اور حکم دے دیا گیا کہ صدر کا اعلان ہوتے ہی سبھی مقامات سے ایک ساتھ کارروائی ہو........ اِدھر تو یہ کارروائی مکمل ہوئی اور دوسری طرف حسبِ وعدہ یحییٰ خان اور مجیب میں آخری گفتگو ہوئی۔ یحییٰ خان نے پوچھا کہ انہوں نے آخری فیصلہ کیا کیا ہے۔ مجیب نے کہا کہ میرا فیصلہ یہی ہے کہ پہلے مارشل لاء اٹھا لیا جائے اور پھر قومی اسمبلی کا اجلاس بلایا جائے۔ یہ سنتے ہی یحییٰ خان ایک طوفان کی طرح باہر آئے۔ غصے سے ان کا چہرہ تمتما رہا تھا......... انہوں نے رات ۱۲ بجے کے قریب مغربی پاکستان کے تمام لیڈروں کو بلایا اور کہا کہ وہ فوراً مشرقی پاکستان چھوڑ کر چلے جائیں اور کسی سے کچھ نہ کہیں۔ ایک اشارہ صدر نے یہ بھی دیا تھا کہ اب آخری تجویز پر عمل کیا جائے گا جس کی وضاحت اب نہیں ہوگی بلکہ شام کو ہو جائے گی۔ مغربی پاکستان کے لیڈر بالکل نہیں سمجھ سکے کہ صدر کیا کہہ رہے ہیں۔ پھر بھی وہ ان کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے کراچی لوٹ گئے۔ مگر بھٹو وہیں رکے رہے۔ صدر نے خود انہیں روک لیا تھا۔"

یہ تفصیل نشیمن کے بیان کے مطابق (کالعدم) عوامی لیگ کے ایک لیڈر کی بیان کردہ ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ کس حد تک مستند ہے لیکن اس حقیقت کا اعتراف خود اس لیڈر کو بھی ہے کہ اس تباہی کی تمام تر ذمہ داری مجیب کے سر ہے۔ صدر یحییٰ خان پر کسی طرح نہیں۔ اسی کی تائید میں اس اخبار نے اپنی ۹ مئی کی اشاعت میں جو کچھ لکھا وہ بھی قابلِ غور ہے۔

۲۔ مزید تائید

"مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کے سبب لاکھوں لوگوں کی جان گئی۔ لاکھوں بے گھر ہو گئے۔ ایک ارب (۱۰۰ کروڑ روپیوں) سے زیادہ کی جائیداد تباہ و برباد ہو گئی اور اندازہ یہ ہے کہ اگر پاکستان ۱۰ سال میں بھی سدھر گیا تو اس کو ایک معجزہ ہی کہا جائیگا۔ اس کے علاوہ دنیا بھر میں اس کی جو بدنامی ہوئی ہے وہ ایک الگ نقصان ہے جس کی تلافی برسوں میں بھی مشکل ہے۔ مگر ایک بہت بڑا سوال جس پر کسی نے ٹھیک طور پر غور نہیں کیا، وہ یہ ہے کہ کیا اس قتلِ عام اور بے حد و حساب تباہی کیلئے یحییٰ خان کی حکومت ذمہ دار تھی یا اس کو کسی بھی طرح سے ذمہ دار قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ مشرقی پاکستان کے نہتے عوام نے نہایت بے سروسامانی کے عالم میں پاکستان کی آزمودہ، تجربہ کار اور تربیت یافتہ فوج کا مقابلہ کیا اور توقع سے زیادہ دنوں تک کیا۔ مگر کیا مجیب الرحمان کو یہ بات معلوم نہ تھی کہ اگر مفاہمت کی بات چیت ٹوٹ گئی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ کیا کسی بھی حیثیت سے مجیب الرحمان اپنے لوگوں کو اس بات کے لئے تیار کر سکتے تھے کہ وہ بے سروسامانی کے عالم میں جدید ترین ہتھیاروں سے لیس فوج کا مقابلہ کر کے اپنی جان قربان کر دیں۔ مجیب الرحمٰن یہ بات آخر کس طاقت کے بل بوتے پر کہتے تھے کہ میں لڑائی کے لئے تیار ہوں۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا نکلتا ہے کہ وہ جنگ کے لئے آمادہ ہو چکے تھے۔ کیا کوئی عقلمند آدمی اپنے ساتھیوں کو یوں قربان کرنے پر تیار ہو سکتا ہے۔ جب شیخ مجیب الرحمٰن گرفتار کر لئے گئے اور وہاں جو کچھ ہوا اس کا علم ہونے کے بعد بھی کیا وہ خاموش رہ کر عوام کا گلا کٹوا سکتے تھے۔ انہوں نے جب یہ جان لیا کہ آزادی اور خود مختاری حاصل کرنے کا وقت ابھی نہیں آیا ہے تو کیا ان کا فرض نہیں تھا کہ فوراً جنگ بند کرا دیں۔ یحییٰ خان کتنے ہی[1] ظالم جابر اور ہٹلر کے سے سفاک ہوں کیا پاکستان کے سربراہ اور ایک ذمہ دار صدر کی حیثیت سے ان کا یہ فرض قرار نہیں پاتا کہ وہ ملک کی سالمیت کو برقرار رکھیں اور امن و امان

[1] یحییٰ خان ایسے نہیں ہیں۔ (طلوعِ اسلام)

قائم کرنے کے لئے بڑی سے بڑی قیمت ادا کریں۔ یحییٰ خان کے سوا کوئی اور ہوتا تو کیا یہی کارروائی نہ کرتا؟ ایک مسلمان کی حیثیت سے اپنے مسلمان بھائی کا قتل کرنا قابلِ مذمت بات ضرور ہے لیکن صدر کی حیثیت سے امن و امان کی برقراری کے لئے اُن کی کارروائی کیا ضروری نہیں ہے۔ خانہ جنگی سے پہلے گیارہ دن تک بات چیت چلتی رہی تھی۔ اس وقت کیا دونوں فریقین کا یہ فرض نہیں تھا کہ صبر و استقلال سے کام لیں اور بات کو بگڑنے نہ دیں۔ مفاہمت کی ہر تجویز کو کس نے ٹھکرایا، اور کیوں۔ مجیب الرحمٰن یہ کیوں بھول گئے کہ وہ جس سے بات چیت کر رہے ہیں وہ نہ صرف پاکستان کا صدر ہے بلکہ فوجی ڈکٹیٹر ہے.... .... مجیب الرحمٰن یہ کیوں بھول گئے کہ اگر بات چیت ٹوٹ گئی تو اس کا نتیجہ جنگ کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ کیا مجیب کو اس بات کا اندازہ لگانا مشکل تھا کہ جنگ کے نتائج بہت ہی ہولناک ہونگے اور مشرقی پاکستان تباہ ہو جائیگا۔ اپنے لوگوں کی حالت جاننے کے باوجود بھی وہ جنگ کے لئے کیوں تیار ہو گئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ مشرقی پاکستان میں لاکھوں نہتے عوام کی جان چلی گئی مگر ایسا کہنے والے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اتنے سارے لوگوں کی جان کیوں گئی۔ اس کی ذمہ داری کس پر آتی ہے۔ اُس وقت جبکہ مجیب الرحمان اکڑ فوں دکھا رہے تھے۔ ان کو روکنے کا خیال تو کسی کو نہیں آیا۔ دانشمندی کی کارروائی تو کسی نے نہیں کی۔ لیکن جب اس غیر دانشمندانہ کارروائی کے نتیجے میں لاکھوں لوگ ہلاک ہو گئے تو افسوس کیا جا رہا ہے۔ اگر مجیب الرحمٰن بات چیت کے وقت مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرتے اور اپنے نکات میں تھوڑی سی تبدیلی برائے نام یا برائے مفاہمت ہی کر دیتے اور ہٹ دھرمی و ضد سے باز آجاتے تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا تھا کہ حالات کچھ اور ہی ہوتے۔ وزیرِ اعظم بن کر اور سب کو اپنے ساتھ لے کر چلتے تو ان کا کچھ بھی نہ بگڑتا تھا۔ اس کے برعکس انہوں نے ایک سنہری موقع بھی اقتدار حاصل کرنے کا گنوا دیا اور لاکھوں لوگوں کو بھی کٹوا دیا۔ خود بھی تباہ ہوئے اور دوسروں کو بھی برباد کیا۔ کوئی سیاسی لیڈر جس کو مدبر کہا جاتا ہے ایسا نہیں کرتا جیسا کہ مجیب الرحمٰن نے کیا۔ احتجاجی تحریک چلانا، عوام کو ورغلانا اور انہیں مرنے مارنے کے لئے تیار کرنا آسان ہے مگر عوام کی صحیح رہنمائی کرنا اور ان کو صحیح راستہ بتانا بالکل مشکل بات ہے۔ لوگوں کو ورغلانے کے لئے صرف نعروں اور انگاروں سے بھری ہوئی تقریروں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن رہنمائی کرنے کے لئے ٹھنڈے دل و دماغ کی۔ مجیب الرحمٰن کی کارروائی کا ابتدا سے آخر تک مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ انہوں نے تدبّر سے ہرگز کام نہیں لیا۔ ایسی حالت میں کیا انصافاً مشرقی پاکستان کی تباہی و بربادی کے لئے یحییٰ خان کو ذمہ دار قرار دیا جا سکتا ہے؟"

—— (۰) ——

۲- مسز اندرا گاندھی اس قدر متأمل کیوں ہیں؟

شیخ مجیب الرحمان کو ذمہ دار قرار دینے کے بعد یہ اخبار اس حقیقت پر سے پردہ اٹھاتا ہے کہ مسز اندرا گاندھی نے تاحال (مرعوص) "بنگلہ دیش" کو تسلیم کیوں نہ کیا؟ یہ حقیقت بڑی دلچسپ ہے اور بنظرِ غائر مطالعہ کے قابل۔ تحریر ہے:-

"اندرا گاندھی نے شیخ مجیب الرحمٰن کی زبردست حمایت کی اور انہوں نے مشرقی پاکستان کو آزاد کرانے کی جو تحریک چلائی اس کو نہ صرف پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا بلکہ اس کی پوری حمایت بھی کی۔ مجیب الرحمٰن کے ساتھیوں کو بہادر کہا اور یقین دلایا کہ ہندوستان ان کے ساتھ ہے اور ان کی ہر طرح کی مدد کرنے پر تیار ہے۔ اس بیان کے فوراً بعد صدر اس اسمبلی میں

وزیر اعلیٰ کرونا ندھی نے بھی ایک بیان دیا۔ مگر فرق یہ تھا کہ جہاں اندرا گاندھی کے بیان سے عوام میں جوش و جذبہ پیدا ہو اتھا وہ کرونا ندھی کے بیان کے ساتھ ٹھنڈا پڑ گیا۔ لوگ حیران و ششدر رہ گئے اور تب کہیں جا کر انہیں معلوم ہوا کہ مغربی پاکستان کی آزادی کے کیا معنی ہندوستان میں لئے جاتے ہیں اور مشرقی پاکستان والوں کی حمایت کے کیا نتائج ہندوستان میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ کرونا ندھی نے صاف صاف الفاظ میں کہا کہ اگر صوبوں اور مرکز کے درمیان جو تعلقات اس وقت ہیں، ان پر نظرثانی نہیں کی گئی، صوبوں کی ترقی کے لئے ان کا جائز حق نہیں دیا گیا، صوبائی آمدنی سے معقول رقم برابر نہیں دی گئی اور صوبوں کو زیادہ سے زیادہ انتظامی آزادی نہیں دی گئی اور صوبوں کو دبائے رکھنے کی کوشش کی گئی تو اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ ہر صوبے میں ایک عجیب بے چینی پیدا ہو جائے گی۔ اس بیان نے اسمبلی کے اندر اور اسمبلی کے باہر کافی ہلچل پیدا کی اور مرکزی لیڈروں کو پریشان کر دیا۔ یہ پہلا ردعمل تھا جو مرکز کی پالیسی سے رونما ہوا۔ پھر کرونا ندھی نے چند دن بعد اسمبلی میں کہا کہ اندرا گاندھی نے مشرقی پاکستان کے بارے میں ہندوستان کی پالیسی متعین کرنے کے لئے اپوزیشن لیڈروں سے تو ملاقات کی اور انہیں اپنا ہمنوا بنا لیا۔ لیکن ریاستی وزرائے اعلیٰ سے کوئی مشورہ تک نہیں کیا اور ان سے کوئی رائے تک لینا گوارا نہیں کی۔ یہ دوسرا حملہ تھا جو مرکز پر کیا گیا۔ یہ گویا مرکزی معاملات میں ریاست کی کھلی مداخلت تھی۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ ان دونوں بیانات سے اندرا گاندھی کی آنکھیں کھل گئی ہونگی اور انہیں یہ معلوم بھی ہو گیا ہوگا کہ جوش و جذبات کے تحت جو کام کیا جاتا ہے اس کے نتائج کیا نکلتے ہیں۔ اندرا گاندھی چونکہ ایک ہوشیار اور چالاک سیاسی لیڈر ہیں اور وقت دیکھ کر کام کرنا جانتی ہیں اس لئے وہ خاموش ہو گئیں کیونکہ انہیں اس بات کا علم تھا کہ اگر کرونا ندھی کے بیانات کا جواب دیا جائے تو ہندوستان میں نہ صرف ہلچل پیدا ہوگی بلکہ ایک نیا مسئلہ بھی چھڑ جائے گا اور کرونا ندھی کو سیاسی اہمیت حاصل ہو جائے گی۔ ہم چاہتے ہیں کہ کرونا ندھی کے بیانات کا پورا پس منظر سمجھ دیں اور بتا دیں کہ انہوں نے یہ بیانات کیوں دیئے اور ان بیانات کے اصل محرکات کیا ہیں۔ کرونا ندھی ڈی۔ ایم۔ کے پارٹی کے صدر اور اسمبلی میں پارٹی کے لیڈر ہیں۔ یہ وہی پارٹی ہے جو ایک زمانے سے دراوڑستان کا نعرہ لگاتی رہی ہے۔ اس پارٹی نے دستورِ ہند کو جلایا تھا۔ اس کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا۔ ہندی کی زبردست مخالفت کی تھی اور صوبائی آزادی کا مطالبہ کیا تھا۔ اس پارٹی کے خلاف ۱۹۶۷ء سے پہلے تک سخت کارروائی بھی کی گئی۔ انادورے نے آزاد دراوڑستان کے نعرہ کو ترک کرنے کا اعلان کیا بھی تھا تو اس لئے کہ انہیں زبردست کارروائی کا خوف تھا۔ ۱۹۶۷ء کے بعد انادورے نے ملک کے سیاسی حالات کا جائزہ لے کر یہ پالیسی بنائی تھی کہ اندرا گاندھی کو چونکہ اکثریت حاصل نہیں ہے اور اپوزیشن مضبوط ہے لہٰذا ان سے دوستی کی جائے اور جس قدر مدد حاصل کی جا سکے کر لی جائے۔ انادورے نے بھی مرکز اور ریاستوں کے تعلقات پر نظرثانی کرنے اور ریاستوں کو زیادہ آزادی دینے کا مطالبہ کیا تھا۔ انادورے کے بعد کرونا ندھی نے بھی اس مطالبے کو دہرایا۔ کچھ عرصہ بعد کانگریس میں پھوٹ پڑ گئی اور کرونا ندھی اندرا کے ساتھ ہو گئے۔ اور اس دوستی سے انہوں نے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ اندرا گاندھی کو ڈی۔ ایم۔ کے کی حمایت کی ضرورت پڑتی اور اس ضرورت کی منہ مانگی قیمت وصول کرتے۔ اتنا سب کچھ دیئے جانے کے بعد بھی انہوں نے ریاستوں کو زیادہ آزادی دینے کا مطالبہ ترک نہیں کیا۔ وہ کہتے کہ مرکز ریاستوں کی ساری آمدنی وصول کئے جا رہا ہے، اور محصولات بھی۔ اس آمدنی کا جتنا حصہ ریاست کو ملنا چاہیئے نہیں ملتا۔ انہوں نے دو سال قبل ایک بہت بڑی کانفرنس بھی مدراس میں کی جس کا نام تھا ریاستوں کو زیادہ اختیارات اور آزادی کی کانفرنس۔ اس کانفرنس میں شرکت کے لئے بنگال سے مکرجی اور پنجاب سے گرنام سنگھ کو خصوصی

طور پر بلایا گیا تھا۔ اس کانفرنس میں کرونا ندھی نے جو تقریر کی تھی وہ مجیب الرحمان کے مطالبات کا ہو بہو چربہ تھی۔ اب مرکز کو کرونا ندھی کی تقریر اور ان کے مطالبات بالکل پسند نہیں آئے۔ انہوں نے کہا کہ ریاستوں کو جتنی آزادی اب حاصل ہے وہی کافی ہے اور دستورِ ہند کی کئی دفعات ایسی ہیں جن پر اگر صحیح طریقہ سے عمل کیا جائے تو ساری شکایات دور کی جا سکتی ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ دستور پر صحیح طرح عمل ہو نہ کہ اس بات کی کہ ریاستوں کو آزادی ملے۔ غرض بتانا یہ ہے کہ کرونا ندھی بھی وہی چاہتے ہیں جو بنگال کے شیخ مجیب الرحمٰن چاہتے تھے۔ اندرا گاندھی اور مرکزی لیڈروں نے کرونا ندھی کے مطالبات کو کبھی بھی منظور نہیں کیا اور نہ اس قسم کی تحریکوں کو پسند کیا بلکہ انہوں نے تو اس کو علیحدگی پسندی کی تحریک کا بھی نام دیا۔ ۔۔۔ میں کرونا ندھی نے اندرا گاندھی کو لکھا کہ مدراس کو اپنا الگ جھنڈا رکھنے کی اجازت دی جائے تاکہ سرکاری عمارتوں، وزیروں کے مکانوں اور سرکاری کاروں پر اس جھنڈے کو لہرایا جا سکے۔ کرونا ندھی کے اس مطالبے میں لوک سبھا میں سخت لے دے ہوئی اور کہا گیا کہ اندرا گاندھی کی کمزوری کے سبب اس قسم کے مطالبات کئے جا رہے ہیں اور اندرا گاندھی اپنی حکومت کو بچانے کے لئے اس قسم کے مطالبات کو تسلیم کر رہی ہے۔ چنانچہ اندرا گاندھی نے اس مطالبے کو نامنظور کر دیا اور کہا کہ ہندوستان کا قومی جھنڈا ایک ہی ہے اور رہے گا۔ ریاستوں کو علیحدہ جھنڈا رکھنے کی اجازت دینا غلط بات ہے۔ پھر جب حکومت ہند نئے ہوائی جہاز خریدے تو کرونا ندھی نے لکھا کہ ان طیاروں کا نام تامل راجاؤں کے نام پر رکھا جائے گا۔ انہوں نے بیکاری کو دور کرنے کے بہانے ایک علاقائی فوج بھی رکھنے کا مطالبہ کیا تھا۔ انہوں نے ہندی زبان کو جو ہندوستان کی سرکاری زبان کا درجہ پا گئی ہے مدراس کی سرحدوں سے دور رکھے جانے کا مطالبہ کیا۔ حد یہ کہ گذشتہ کی نئی لوک سبھا میں جب سیٹھ گووند داس نے یہ درخواست کی کہ لوک سبھا کی کارروائی زیادہ تر ہندی زبان میں کی جائے تو کرونا ندھی نے کہا کہ اس قسم کی باتیں اگر دوبارہ کی گئیں تو اس کے نتائج اچھے نہیں ہوں گے۔ کرونا ندھی کے مطالبات جتنے بھی کئے گئے مرکز نے ان کو مسترد کر دیا اور کہا کہ یہ سب علیحدگی پسندوں کو دعوت دینے والے اور غلط ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان میں برائی کیا تھی۔ خود کرونا ندھی نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ وہ ہندوستان سے الگ ہو جانا یا مرکز کو کمزور کرنا نہیں چاہتے بلکہ وہ صرف اپنا حق مانگ رہے ہیں۔ جب کرونا ندھی کی نیت صاف ہے اور دوسرے کسی صوبے نے بھی ایسا مطالبہ نہیں کیا تھا تو پھر اس کو منظور کیوں نہیں کیا گیا اور اس کو مسترد کیوں کر دیا۔ صرف اس وجہ سے ناکہ ہندوستان کی سالمیت خطرے میں پڑ جائے گی اور مرکز کمزور ہو جائے گا۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر شیخ مجیب کے مطالبات کو جو اسی قسم کے ہیں، یحییٰ خان کیوں نامنظور نہ کریں۔ اور ان کو علیحدگی پسند رجحانات کا نام کیوں نہ دیں۔ انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ سب کے ساتھ ایک ہی طرح کی کارروائی ہو۔ ہمارا اصول اپنے لئے الگ اور پاکستان کے لئے الگ کیسا ہو سکتا ہے۔ اگر ہندی کو تسلیم نہ کرنا، الگ جھنڈے کی اجازت طلب کرنا، زیادہ آزادی طلب کرنا، ناانصافیوں کو درست کرنے کا مطالبہ کرنا، نامناسب باتیں ہیں، اور ان سے ہندوستان کی سالمیت کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے تو مشرقی پاکستان میں مجیب کا اردو کی مخالفت کرنا، بنگلہ دیش کا جھنڈا لگانا، آزادی اور خودمختاری طلب کرنا، ٹیکس لگانے کی اجازت طلب کرنا، پاکستان حکومت کے لئے بھی کیسے مناسب اور قابلِ قبول باتیں ہو سکتی ہیں۔ جب ہندوستان نے کرونا ندھی کے مطالبات کو منظور نہیں کیا تو پاکستان مجیب کے مطالبات کو کیوں منظور کرے۔ جب کرونا ندھی کے مطالبات ہندوستان کی آزادی اور سالمیت کے لئے خطرہ ہیں تو مجیب کے مطالبات بھی پاکستان کی آزادی اور سالمیت کے لئے کھلا چیلنج ہیں۔ ڈی ایم کے کو مدراس اسمبلی میں بھی اسی طرح اکثریت حاصل ہے جیسی کہ مجیب کو قومی اسمبلی میں حاصل ہے۔ ۲۳۴ کی مدراس اسمبلی میں ۱۸۴۔ اگر وہ اس اکثریت کے نام پر اپنے مطالبات

کو منوانے کے لئے خم ٹھونک کر کھڑے ہو جائیں تو تب اندرا گاندھی کیا کریں گی۔" (سٹیٹسمین - بابت ۱۲ مئی)

غور فرمایئے کہ اس اخبار نے کس قدر حق و صداقت کی بات کی ہے اور اندرا گاندھی کو کیسی کھری کھری سنائی ہیں کہ اگر ہندوستان میں اس قسم کے مطالبات کھڑے کئے جائیں تو انہیں مسترد کرنے اور اس قسم کے رجحانات کو ختم کرنے کو عین حب الوطنی اور تقاضائے انصاف قرار دیا جائے، اور اگر اسی قسم کے حالات دوسروں کے ہاں (پاکستان میں) رونما ہوں تو صرف یہ کہ ان کی اس قدر حمایت کی جائے بلکہ انہیں ختم کرنے کے اقدامات کو ظلم و غارتگری قرار دے کر آسمان سر پہ اٹھا لیا جائے؟ یہ ہے گاندھیائی سیاست!

---(۸)---

۴۔ افواجِ پاکستان کی تعریف و توصیف اور (کالعدم) عوامی لیگ کے لیڈروں کی بزدلی

اس سلسلہ میں اخبار مذکور نے، اپنی ۹ مئی کی اشاعت میں صفحہ اول پر جلی حروف میں یہ سرخی جمائی ہے "بنگلہ دیش کا قصہ تمام ہو گیا۔ مشرقی پاکستان میں نہ عوامی لیگ باقی ہے اور نہ اس کا کوئی لیڈر"۔ اور اس کے نیچے لکھا ہے۔

"مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کے آغاز کو ایک ماہ دس دن کا عرصہ گزر گیا اور فوج نے اپنے پلان کے مطابق آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے تمام مقامات سے مجیب کے ساتھیوں کو چن چن کر ختم کر دیا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کا ایک لیڈر بھی نہیں ہے اور عوام کی وہ ٹولیاں جن کو مکتی فوج کا نام دیا جا رہا ہے، اس کی رہنمائی یا رہبری کرنے والا کوئی نہیں۔ فوج نے سب سے پہلے تیار کردہ فہرست کے مطابق قومی اسمبلی میں عوامی لیگ کے لیڈروں کو (جتنے بھی مل سکے) قتل کر دیا۔ اور ان کے خاندانوں کا صفایا کر دیا۔ چند ایک کو جنہوں نے معافی چاہ لی، گرفتار کر لیا۔ لیکن بہت سے ہندوستان بھاگ آنے میں کامیاب ہو گئے۔ باوثوق ذریعہ سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آسام، تریپورہ اور مغربی بنگال میں اکثر پناہ لے چکے ہیں۔ صرف کلکتہ میں اس وقت قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کے ۱۰۰ اراکین موجود ہیں۔ اپنے ساتھ انہوں نے چند شوریدہ پسند طلباء کو بھی ہندوستان میں پناہ دلائی ہے۔ یہ لوگ کس درجہ عزم و ہمت کے مالک ہیں اور آزادی کے حصول کے لئے ان کی تیاری کا کیا عالم ہے، اس کا اندازہ ان کی گفتگو اور بیانات سے ہوتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان ان کی خاطر جنگ لڑے اور انہیں پاکستانی حکمرانوں سے نجات دلائے۔ عوامی لیگ کے لیڈروں نے اس بات کا کھلے طور پر اعتراف کیا ہے کہ مشرقی پاکستان میں عوام کے حوصلے پست ہو چکے ہیں اور پاکستانی فوج کا خوف عوام کے دلوں میں اس قدر گھر کر چکا ہے کہ وہ گھروں سے باہر تک نہیں نکلتے۔ وہ خود برقعے پہن کر کلکتہ بھاگ آئے ہیں۔ ان لیڈروں کا کہنا ہے کہ جب تک ہندوستان ان کا ساتھ نہیں دیتا مشرقی پاکستان میں مقابلہ کرنے کی کسی میں ہمت نہیں۔ چنانچہ ان لیڈروں نے ہندوستان میں بیٹھ کر پاکستان میں کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اور اگر ہندوستان نے تائید نہیں کی تو یہیں خاموش بیٹھ جانے کا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ مشرقی پاکستان رائفلز، پولیس، مجاہد اور انصار سب مل کر بھی فوج کی پیش قدمی کو روکنے میں ناکام رہے اور فوج نے جہاں کہیں بھی حملہ کیا وہاں کے تمام علاقوں کا اور مقابلہ کرنے والوں کا صفایا کر کے رکھ دیا۔ باوثوق ذریعہ سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ عوامی لیگ کے لیڈروں پر مغربی بنگال کے لیڈر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ وہ مشرقی پاکستان واپس جا کر عوامی فوج کی قیادت سنبھال لیں۔ کیونکہ اس وقت وہاں اُن کا جانا بہت ضروری ہے۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ چونکہ بنگلہ دیش کی پوری حکومت ہندوستان میں بیٹھ کر کارروائیاں کر رہی ہے اور اعلانات جاری

نہ حکومت پاکستان نے ایسا نہیں کیا۔ (طلوعِ اسلام)

کر رہی ہے۔ لہٰذا دنیا میں ستم بالائے ستم کی بدگمانیاں بھی پھیل رہی ہیں اور اس کے اثرات بھی خاطر خواہ نہیں نکل رہے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ ان لیڈروں کو سلہٹ ضلع کے علاقوں میں جو آسام کی سرحدوں سے لگے ہوئے ہیں چلے جانے کی درخواست کی گئی۔ مگر کوئی بھی مشرقی پاکستان جانے کے لئے تیار نہیں۔ سب لیڈروں کو اپنی اپنی جان بچانے کی فکر ہے اور کسی کو عوام کی جان کی فکر نہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عوامی لیگ کے لیڈروں کے حوصلے پست کیوں ہو گئے ہیں۔ اس لئے کہ پاکستان کی فوج زبردست اور جدید ترین ہتھیاروں سے حملہ آور ہوئی ہے اور صرف چند دن تک جو کارروائی کی اس سے پورے صوبے میں ایسی بھاگ دوڑ مچی کہ سب اپنی جان بچا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ پاکستان کی فوج تجربہ کار اور تربیت یافتہ ہے۔ لہٰذا ہر جگہ اس کا پلہ بھاری رہا اور کسی بھی مقام پر عوامی فوج ٹھہر نہ سکی۔ چند ایک مقامات پر مقابلہ سخت رہا مگر کامیابی آخرکار فوج ہی کی رہی۔ عوامی لیگ کے لیڈروں کا خیال یہ تھا کہ ہر طرف سے ان کی تائید و حمایت ہوگی۔ پاکستان کے حکمران مشکل میں پڑ جائیں گے۔ مغربی پاکستان میں سندھ، بلوچستان وغیرہ میں بغاوت ہوگی، یا کم از کم فوج میں اتحاد باقی نہیں رہے گا۔ اگر یہ سب کچھ نہ بھی ہوا تو بڑی طاقتوں کی مخالفت سے پاکستانی حکمران پریشان ضرور ہوں گے۔ چونکہ توقع کے مطابق یہ سب نہیں ہوا لہٰذا عوامی لیگ کے لیڈروں کے حوصلے پست ہو گئے ہیں۔ ان لیڈروں کے واپس نہ جانے کی وجہ یہ ہے کہ پاکستانی فوج نے سرحدوں پر مہر لگا دی ہے۔ ....

...... اب حل طلب بات یہ ہے کہ عوامی لیگ کے لیڈر کب تک ہندوستان میں رہیں گے اور یہاں رہ کر کیا کریں گے۔ اگر یہاں ان کا قیام گوارا نہ ہوا تو ان کو کہاں بھیجا جائے گا۔ اور وہ لاکھوں پناہ گزین جو مشرقی پاکستان سے بھاگ کر یہاں آئے ہیں، ان کو کہاں بسایا جائے گا۔ پاکستان کہہ رہا ہے کہ مشرقی پاکستان سے اس کا ایک بھی شہری ہندوستان کی سرحدوں پر نہیں آیا ہے[1] بلکہ وہ لوگ جو پناہ گزینوں کی شکل میں ہندوستان کی سرحد پر ہیں، وہ کلکتہ شہر کے فٹ پاتھ پر سونے والے بے گھر ہندوستانی ہیں۔ ہندوستان ان بے گھر لوگوں کو مشرقی پاکستان کے باشندوں کا نام دے کر امداد حاصل کرنے اور پاکستان کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

۵۔ انجام کیا ہوا؟

اس کے بعد اس اخبار نے مندرجہ بالا عنوان کے ماتحت حسب ذیل اداریہ شائع کیا ہے۔

"اب یہ بات تو روزِ روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ مشرقی پاکستان میں نہ آزاد بنگلہ دیش نامی کوئی حکومت ہے اور نہ اس کے کنٹرول میں کوئی علاقہ ہے۔ لہٰذا اس کے تسلیم کئے جانے یا اس کی تائید و حمایت کرنے کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہا۔..

.... اندرا گاندھی کو توقع تھی کہ اگر مجیب کے ساتھی واقعی جواں مرد، جانباز اور قربانی کے جذبے سے سرشار ہیں اور جیسا کہ کہا جاتا تھا کہ مشرقی پاکستان کا ایک ایک فرد مجیب کے ساتھ ہے تو سب مل کر فوج کا سخت مقابلہ کریں گے اور عوام کی فوج مغربی پاکستان کی فوج کو آگے نہ بڑھنے دیگی۔ اندرا گاندھی کو یہ بھی امید تھی کہ دنیا کی بڑی طاقتیں مشرقی پاکستان کے عوام کا ساتھ دیں گی اور سب نہیں تو کم از کم روس ضرور پاکستان پر دباؤ ڈالے گا اور خون خرابہ بند کرائے گا۔ امریکہ ہتھیاروں کی سپلائی روک دے گا۔ اندرا گاندھی یہ بھی سمجھتی تھیں کہ عوامی لیگ کے لیڈر جو اپنی جان بچا کر ہندوستان بھاگ آئے ہیں اور اپنے ساتھیوں کو وہاں مرنے کے لئے چھوڑ آئے ہیں ضرور کوئی کارروائی کریں گے اور اعلان شدہ نئی آزاد بنگلہ حکومت کو

---

[1] حکومتِ پاکستان نے ایسا نہیں کہا۔ (طلوعِ اسلام)

بچ جاتیں گے۔ مگر ان کی ایک بھی امید پوری نہ ہوتی۔ اندرا گاندھی اگر چاہتیں تو بہت پہلے ہی نئی حکومت کو تسلیم کر لیتیں اور ان کی مدد کرتیں۔ مگر وہ دیکھنا چاہتی تھیں کہ معاملہ اصل میں کیا ہے اور عوامی لیگ کے لیڈروں کے دعووں میں کہاں تک صداقت ہے اور ان کا اصل مقصد کیا ہے۔ وہ یہ بھی دیکھنا چاہتی تھیں کہ اس معاملہ میں دوسرے ممالک کیا مؤقف اختیار کرتے ہیں' اور حالات آگے چل کر کیا رُخ اختیار کرتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے شملہ میں آٹھ دن تک چھٹیاں منائیں۔ اپنے قیام کے دوران انہوں نے نہ تو مشرقی پاکستان کے بارے میں کوئی بیان دیا اور نہ شملہ سے واپس آکر حکومتِ ہند کے مؤقف کی وضاحت کی جس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی تھی کہ انہوں نے پورے معاملہ کو سمجھ لیا ہے اور اُن دعووں کی حقیقت بھی انہیں معلوم ہو چکی ہے جو عوامی لیگ کے لیڈر کلکتہ میں بیٹھ کر کیا کرتے تھے۔ وہ جو آزادی پر جان دینے والے ہوتے ہیں' عوام کے صحیح رہبر و رہنما ہوتے ہیں۔ ملک کو تباہی و بربادی سے بچانے والے ہوتے ہیں۔ وہ گاندھی جی' پنڈت نہرو اور مولانا آزاد جیسے ہوتے ہیں اور آخری دم تک عوام کے ساتھ رہتے اور اپنی جانوں کو قربان کر دیتے ہیں۔ وہ بھاشانی' تاج الدین اور نذر الاسلام جیسے بھگوڑے اور نادان نہیں ہوتے۔

اندرا گاندھی کو صرف ۱۰ دن کے اندر اندر معلوم ہو گیا کہ مشرقی پاکستان کا حشر کیا ہونے والا ہے اور مغربی پاکستان کی فوج کیا کرنے والی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے خاموشی اختیار کر لی کیونکہ وہ دیکھ رہی تھیں کہ نہ صرف یہ کہ عوامی لیگ کے لیڈروں میں کوئی جان نہیں ہے بلکہ عالمی رائے عامہ بھی مشرقی پاکستان کے عوام کے ساتھ نہیں ہے ورنہ دنیا بھر میں دھوم ہو جاتی اور ہر طرف سے لعنت و ملامت کی بوچھاڑ ہو جاتی۔ چونکہ ایسا نہیں ہوا' اس لئے اندرا گاندھی نے انسانی ہمدردی کے ناطے جو کچھ بھی کر سکتی تھیں، کر کے خاموش ہو گئیں۔[1] اور یہ بات بعد میں انہیں معلوم ہو گئی کہ عوامی لیگ کے لیڈر بھی بیافرا کے اس جنرل کی طرح ہیں جو لاکھوں لوگوں کو آزادی کے نام پر کٹوا کر پیرس بھاگ گیا اور جاتے ہوئے اپنے پورے خاندان' اپنی سفید کار' اپنے کتوں بالتو پرندوں اور لاکھوں بچپنے مالیت کی سونے کی سلاخوں کو بھی ساتھ لے گیا۔ عوامی لیگ کے لیڈر اپنا سب کچھ لے کر اسی طرح ہندوستان بھاگ آئے ہیں۔"

۸۔ جغرافیائی بُعد کی کوئی حیثیت نہیں

پاکستان دشمنی کے جذبے کے ماتحت' ہندوستان میں اس سوال کو بڑے شدّومد سے اچھالا جاتا ہے کہ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان میں جو بُعدِ مسافت ہے' اس کے پیشِ نظر' یہ دونوں حصے ایک مملکت کا جزو بن سکتے ہیں' اور نہ ہی مغربی پاکستان کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ مشرقی پاکستان پر حکومت کرے۔ ہمارے پاس تو اس سوال کا صاف اور سیدھا جواب موجود ہے کہ جس دو قومی نظریہ کی رُو سے پاکستان وجود میں آیا ہے' اس میں جغرافیائی بُعد کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتا۔ اس نظریہ کی رُو سے' قومیت کا مدار ایمان کا اشتراک ہے نہ کہ وطن کی چار دیواری۔ اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ قطبِ شمالی اور قطبِ جنوبی میں رہنے والے مسلمان' ایک قوم کے افراد ہیں لیکن ایک ہی شہر میں رہنے والے مسلمان اور ہندو ایک قوم کے افراد تسلیم نہیں کئے جا سکتے۔ یہی وہ نظریہ ہے جس کی رُو سے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے مسلمان ایک قوم کے افراد قرار پاتے ہیں اور پاکستان اس ایک قوم کی مملکت ہے۔ اس اعتبار سے' مشرقی پاکستان کا مغربی پاکستان پر یا مغربی پاکستان کا مشرقی پاکستان پر حکومت کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک مملکت میں بسنے والی قوم کے افراد ایک دوسرے پر

---

[1] انسانی ہمدردی کے ناطے سے نہیں' پاکستان دشمنی کے جذبہ کے ماتحت۔ (طلوعِ اسلام)

حکومت نہیں کیا کرتے۔ حکومت ان سب کی مشترکہ ہوتی ہے۔

یہ تو ہے ہمارا جواب۔ لیکن اہل ہند سیکولر حکومت کے قائل ہیں اس لئے وہ اس جواب سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔ ہندوستان میں جو لوگ یہ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی اس قدر بُعد مسافت کی موجودگی میں' یہ دونوں حصے ایک مملکت کے اجزا نہیں ہو سکتے' ان کا جو جواب' اخبار نشیمن نے سیکولر نقطۂ نگاہ سے دیا ہے' وہ ان لوگوں کے لئے جو سیکولر انداز کے قائل ہیں غور طلب ہے۔ ہم پھر واضح کر دیں کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے اس اعتراض کا جواب وہی ہے جس کی ہم نے اوپر وضاحت کی ہے۔ نشیمن کا جواب سیکولر انداز کا ترجمان ہے۔ وھوھذا۔

بعض وہ صحافی جو اپنے آپ کو بے حد دانا' زمانہ شناس' تاریخ پر عبور رکھنے والا سمجھتے ہیں اور جن کو تاریخ کی دلدوز چنگھاڑیں سنائی دینے لگی ہیں' ان کا کہنا ہے کہ پاکستان کے درمیان جو جغرافیائی فاصلہ ہے اور جو تہذیبی' تمدنی' لسانی اختلافات پاکستان کے دونوں بازوؤں میں پائے جاتے ہیں' وہ پاکستان کو متحد نہیں رکھ سکتے" اور پاکستان کے فوجی حکمران مشرقی بازو کو گولی کے زور پر غلام بنائے نہیں رکھ سکتے۔ ان صحافیوں کو اگر ذرا بھی عقل ہے تو ہمیں بتائیں کہ

- کیا برطانیہ چھ ہزار میل دور بیٹھ کر ہانگ کانگ پر حکومت نہیں چلا رہا ہے۔ کیا ہانگ کانگ کو اپنا بنائے رکھنے کے لئے وہ گولیوں کا استعمال کر رہا ہے۔
- کیا جبرالٹر نامی جزیرہ پر اُس کی جو حکومت چل رہی ہے وہ اُس کی نو آبادیاتی پالیسی کا نتیجہ ہے۔
- کیا ہنگری' پولینڈ اور زیکوسلاویکیہ پر روس آج بھی حکومت نہیں چلا رہا ہے حالانکہ کہا جاتا ہے کہ وہاں کے عوام روس کی بالادستی کو پسند نہیں کرتے۔ کیا عوام کی تائید وحمایت نہ ہونے کے باوجود ان ملکوں میں حکومتیں نہیں چل رہی ہیں۔
- برلن کو ایک کرنے کی کتنی کوششیں ۲۴ سال سے نہیں کی گئیں اور عوام کے نہ چاہتے ہوئے بھی کیا یہاں حکومت نہیں چل رہی ہے؟
- کیا ایریٹریا کے لاکھوں مسلمانوں کو حبشہ کے شہنشاہ ہیل سلاسی نے برسوں سے دبائے نہیں رکھا ہے۔ آزادی کی اس تحریک کو اگر دبایا جا رہا ہے تو کس طاقت کے بل بوتے پر۔
- کیا ۲۰ برس سے اسرائیل عربوں کی سرزمین پر حکومت جمائے نہیں بیٹھا ہے۔ اگر بیٹھا ہے تو یہ طاقت اسے کہاں سے مل گئی۔
- بیت المقدس سینکڑوں سال سے مسلمانوں کے قبضے میں تھا۔ اسرائیل نے زبردستی اس پر قبضہ کر لیا اور اب کہتا ہے کہ اسکو نہیں چھوڑوں گا حالانکہ اقوام متحدہ نے تین سال پہلے قرارداد منظور کی ہے۔ اگر اسرائیل بیت المقدس کو چھوڑنے پر تیار نہیں اور اسکو اپنا بنائے رکھنے کے لئے وہ ہر طاقت کا مقابلہ کرنے کو تیار ہے اور اپنے عزم وارادے میں کامیاب بھی ہے تو اس کو یہ طاقت کہاں سے مل گئی۔ وہ طاقت سوائے گولی کے اور کونسی طاقت ہے۔
- کیا عرب مقبوضہ علاقوں کے باشندے اسرائیل کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں اور اسرائیل حکومت کو پسند کر رہے ہیں مگر اسرائیل یہ جانتے ہوئے بھی کہ عوام کی حمایت کے بغیر حکومت نہیں کی جا سکتی' کیا ۴ سال سے حکومت نہیں چلا رہا ہے اور ان تمام علاقوں کو ہمیشہ ہمیشہ اپنے قبضہ میں رکھ لینے کا دعویٰ نہیں کر رہا ہے۔
- کیا امریکہ کوریا' ویت نام' کمبوڈیا وغیرہ ملکوں پر ہزاروں میل دور بیٹھ کر آج بھی حکومت نہیں کر رہا ہے۔ اگر یہ سب کچھ ہو سکتا ہے تو پھر اسلام آباد میں بیٹھ کر مشرقی پاکستان پر حکومت کیوں نہیں کی جا سکتی۔ اگر کی جائے تو اس میں برائی کیا ہے اور ایسی حکومت مؤثر کیوں نہیں ہو سکتی۔ اگر عوام کی حمایت کے بغیر حکومت چل نہیں سکتی" تو زیکوسلاویکیہ' ہنگری' پولینڈ' اور

مشرقی برلن پر روس کی حکومت ۳۰ سال سے کیونکر چل رہی ہے۔ روس ان ملکوں سے کیوں نہیں نکل جاتا۔ برطانیہ ہانگ کانگ کو کیوں نہیں چھوڑ دیتا۔ امریکہ ۔۔۔ ویت نام، کمبوڈیا اور کوریا سے اپنی فوجیں کیوں نہیں نکال لیتا۔

● کہا جاتا ہے کہ مشرقی پاکستان کے عوام کی حمایت ہندوستان محض انسانی جانوں کے احترام کے نام پر کر رہا ہے' اور ایسا کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مشرقی پاکستان میں ہندو اور مسلمان سب مل کر رہتے ہیں مگر ۱۹۶۴ء میں جو ہزاروں نہیں لاکھوں مہاجر بھاگ کر آئے تھے اور یہاں آکر وہاں کے ہندوؤں کی قتل عام کی جو کہانیاں سنائی تھیں اور جن کو حکومت ہند نے سچ سمجھا، لوک سبھا میں جن سنگھیوں اور دیگر فرقہ پرستوں نے اسکے خلاف جو احتجاج کئے تھے، کیا وہ تمام کہانیاں سچی تھیں' تو ان بنگالیوں کو مارنے والا کون تھا اور بھگانے والا کون تھا، اس وقت مجیب الرحمٰن کہاں تھے۔ جب بنگالی سب ایک ہیں تو پھر بنگالیوں کو مار بھگانے والے بنگالی نہیں تھے تو پھر کون تھے ؟"

———— (○) ————

۷۔ بھارتی پریس کی غلط بیانیاں

اس باب میں "نشیمن" اپنی ۹ مئی کی اشاعت میں لکھتا ہے :۔

"مشرقی پاکستان کے سلسلہ میں ہمارے لیڈروں نے جو کچھ کہا اور کیا، اخبارات نے جو کچھ لکھا اور آل انڈیا ریڈیو نے جو کچھ نشر کیا اُس کے متعلق خود ہندوستان کے بعض لیڈروں نے، صحافیوں اور دانشوروں نے کن خیالات کا اظہار کیا ہے، اس کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کیا جا رہا ہے :۔

● ہمت ویکلی بمبئی کے چیف ایڈیٹر راج موہن گاندھی نے ۳۰ راپریل کے اداریہ نوٹ میں لکھا ہے ۔ "جب میں ۱۷ راپریل کو زیر نظر سطریں لکھ رہا تھا تو ہندوستانی اخبارات کہہ رہے تھے کہ مکتی فوج پاکستانی افواج کی پیش قدمی کو روکنے میں کامیاب ہو گئی ہے مگر برطانیہ اور یورپ کے نامہ نگاروں نے جو خبریں روانہ کیں' ان میں بتایا گیا ہے کہ پاکستانی فوج نے بڑی حد تک پورے صوبے پر اپنا کنٹرول قائم کر لیا ہے۔ یہ نامہ نگار بھی کلکتہ اور مشرقی پاکستان کی سرحدوں کے قریب ہی موجود تھے۔ سوال یہ ہے کہ ہمارے نامہ نگاروں کو مکتی فوج کی کامیابی کا پتہ کیسے چل گیا اور بیرونی نامہ نگاروں کو کیوں نہیں۔ ہندوستان کا پریس مشرقی پاکستان کی جنگ میں نہ صرف جانبدار رہا بلکہ جذبات سے مغلوب بھی ہو گیا۔ پاکستان کے مخالف جذبے نے دانشمندی اور احتیاط کے جذبے کو بھی باقی نہ رکھا اور غیر جانبدارانہ حیثیت کو ساری دنیا میں متاثر کر کے رکھ دیا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ آخر وہ کیا بات تھی جو ہمیں جلد بازی کے ساتھ مکتی فوج کی فتح اور کامیابی کے قصے بیان کرنے پر مجبور کرتی رہی۔ وہ لوگ جو جنگ ہار رہے تھے ان کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ جیت رہے ہیں نہ صرف بری بات ہے بلکہ انتہا درجے کی منافقی اور بزدلی ہے۔ عوام جوش وجذبے کا شکار ہو جائیں' انہیں کوئی پوچھتا نہیں لیکن ذمہ دار صحافی بھی عقل و ہوش کو خیرباد کہدیں اور ہندوپاکستان کی دوستی کا لحاظ نہ کریں، اسکی افادیت اور اہمیت کو بھول جائیں' یہ سب سے بڑے دکھ کی بات نہیں تو پھر کیا ہے۔

● ہمت ویکلی کے ایڈیٹر آر۔ ایم۔ لالہ نے اسی شمارے میں لکھا ہے کہ "ہم نے کلکتہ میں پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمیشن کی عمارت کو خالی کرانے سے انکار کر دیا۔ کیا ہماری یہ کارروائی ٹھیک تھی۔ اگر نائیجیریا کی جنگ کے دوران بیافرا سے ہمدردی رکھنے والا کوئی ملازم جو نئی دہلی کے سفارتخانے میں کام کرتا تھا، عمارت پر قبضہ کر لیتا اور اس کو چھوڑنے سے انکار کر دیتا تو کیا حکومت ہند نائیجیریا کی

فیڈرل حکومت سے کہنی کہ عدالت میں جا کر اپنی عمارت لے لو۔ ہمارا فرض تو یہ ہے کہ ہم ہندوستان کی سرزمین پر پاکستان کی جائیداد کی حفاظت کریں، اور مالک کو اس کی چیز دلوائیں۔"

● ہندوستان کے مشہور صحافی اے۔جی۔ نورانی نے لکھا ہے کہ "بیرونی دنیا والے جن کی نظریں پاکستان میں ہونے والے واقعات کے متعلق صحیح صحیح باتیں جاننے کے لئے ہم پر لگی ہوئی تھیں بہت مایوس ہوئے۔ ہندوستانی اخبارات نے جو کچھ بھی شائع کیا اس کو باہر تسلیم ہی نہیں کیا گیا۔ کلکتہ سے میکائیل ہارنس بائی نے "دی ٹائمز لندن" کو اپنے مراسلے میں لکھا ہے کہ "ہندوستانی اخبارات نے جو جانبدارانہ رپورٹیں روزانہ پاکستانی افواج کی شکست اور مجاہدین کی جانبازانہ اور سرفروشانہ مخالفت کے سلسلے میں شائع کیں وہ خوش فہمیوں پر مبنی اور حقیقت سے بالکل بے تعلق تھیں۔ کسی کو ان کی سچائی پر یقین نہیں آتا اور ان پر بھروسہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ خبریں معیار اور مقصد دونوں لحاظ سے گری ہوئی تھیں (ٹائمز ۱۵ مارچ) ایک اور نامہ نگار برنولی ہیل نے یہاں تک لکھ دیا کہ "ہندوستانی اخبارات نے ذمہ داری کے احساس ہی کو ختم کر کے رپورٹنگ کی ہے"

اس کے بعد ہم بھارتی پریس اور وہاں کی حکومت کو اس سے زیادہ اور کیا کہیں کہ ۔۔۔ شرم تم کو مگر نہیں آتی۔

(۰)

۸- اصلی سبب

مشرقی پاکستان میں جو کچھ ہوا ہے اس کے متعلق ہم پہلے دن سے لکھتے چلے آئے ہیں کہ اس کا حقیقی اور بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم نے وہاں کی نئی نسل کو نہ اسلام کی تعلیم سے آگاہ کیا، نہ نظریۂ پاکستان کے متعلق کچھ بتایا۔ اس کے برعکس، وہاں ہندوؤں نے اپنی تہذیب، تمدن، نظریات کو بنگالی قومیت اور بنگالی کلچر کے ادب میں اس قدر عام کیا کہ وہاں کی نژادِ نو کیسر اسی رنگ میں رنگی گئی۔ اس کا ایک اور ثبوت ہمایوں کبیر مرحوم کی بیٹی لیلےٰ کبیر کے اس بیان میں سامنے آئیگا جو اس نے مشرقی پاکستان کے چند روزہ قیام کے بعد ہندوستان واپس جا کر دیا اور جسے سٹیٹسمین نے اپنی ۱۸ اپریل کی اشاعت میں درج کیا ہے۔ ہمایوں کبیر ہندوستان کے متشدد قومیت پرستوں میں سے تھے اور (غالباً) ایک وقت میں وہاں کی مرکزی حکومت میں نائب وزیر کے عہدہ پر فائز بھی رہے۔ وہ (مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) کے خاص معتمد علیہ تھے۔ ان کی سوانح عمری (INDIA WINS FREEDOM) انہی (ہمایوں کبیر ہی) نے مرتب کی تھی۔ یہ بیان ان کی بیٹی کا ہے:-

وہ ہمایوں کبیر کی بیٹی لیلےٰ کبیر جن کی پیدائش فریدپور (مشرقی پاکستان) کی ہے، ابھی کچھ عرصہ پہلے ڈھاکہ میں ایک شادی کے سلسلے میں مشرقی پاکستان گئی تھیں، وہاں مشرقی پاکستان کے مسلمان بھائیوں اور بہنوں کی جو حالت انہوں نے دیکھی اس کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس تفصیل کو پڑھ کر اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ مجیب الرحمٰن اور ان کے ساتھیوں نے کیا کارروائیاں وہاں کی تھیں اور مغربی پاکستانیوں کو پریشان کرنے اور ان سے اپنے آپ کو الگ کرنے کے انتظامات انہوں نے کیا کچھ کر رکھے تھے۔۔۔

لیلیٰ کبیر لکھتی ہیں کہ مجھے ۲۰ سال بعد پاکستان جانے کا اتفاق ہوا تھا اور میں مشرقی پاکستان کو ایک اسلامی کلچر والا ملک سمجھتی تھی۔ چنانچہ میں نے اس خیال سے اپنی کثیر رنگوں والی "بندیا" نہیں لی (جس کا استعمال میں بلاناغہ کرتی تھی) تاکہ اس کو دیکھ کر دوسروں کو افسوس نہ ہو اور وہ میرے بارے میں کوئی غلط رائے قائم نہ کریں۔ میں نے سیپی وغیرہ کی مالائیں اور دوسری چوڑیاں وغیرہ بھی نہیں لیں۔ لیکن وہاں میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی کہ مشرقی پاکستان کی لڑکیاں نہ صرف اپنے ماتھے پر بندیا لگاتی ہیں بلکہ دوسرے

کام بھی کرتی ہیں جن کو مسلمان پسند نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر جس شادی میں میں نے شرکت کی، وہاں دولہا دلہن کے لئے اسٹیج بنایا گیا تھا۔ اس کو بالکل ہندو رواج کے مطابق سنوارا گیا تھا۔ دلہا دلہن کی آرتی اتاری گئی اور ان کے گلے میں زرد رکت مالائیں ڈالی گئیں۔ کھانے بھی بالکل ہندو طرز پر پکائے گئے۔ شادی میں جتنی بھی عورتوں نے شرکت کی ان سب نے چوڑے بارڈر کی ساڑھیاں پہن رکھی تھیں۔ یہ وہی ساڑھیاں ہیں جو میرے زمانے میں صرف ہندو عورتیں پہنتی تھیں۔ میں نے ڈھاکہ سے فرید پور تک دیکھا کہ ایک ہندو اور مسلم عورت میں زبان، رنگ، ڈھنگ، رہن سہن اور لباس اور دوسری پسند میں کوئی فرق نہ تھا اور یہ پہچاننا مشکل تھا کہ ہندو کون ہے اور مسلمان عورت کون۔ میں نے اپنے کانوں سے تمام اسکولوں میں رابندرناتھ ٹیگور کی نظموں کو پڑھتے اور گاتے سنا۔ عورتوں کے ایک خاص جلسے میں میں نے شرکت کی تو آخر میں سب نے مل کر ہندوستان کا قومی ترانہ "جن گن منا" گایا۔ میں نے پوچھا کہ تم لوگ ہندوستان کا قومی ترانہ کیوں گا رہی ہو اور پاکستان کے قومی ترانہ کو کیوں بھول گئیں تو جواب دیا کہ یہ ہمارے دیش کے پتا ٹیگور کی نظم ہے اور ہمیں پسند ہے۔ اس جواب کو سن کر مجھے خیال آیا کہ ۱۵ سال پہلے جب میں یہاں آتی تھی تو کسی میں ایسا کہنے کی جرأت نہیں تھی اور یہ بات ممکن بھی نہ تھی۔ مجیب الرحمٰن کے طفیل یہ ممکن ہو سکا۔ میں نے ایک جگہ جہاں پر کافی عورتیں آئی تھیں ایک بے حد خوبصورت نوجوان لڑکی سے بات چیت کی۔ اس نے مجھے بتایا کہ مسلح جلد جلدی مشرقی پاکستان کو آزاد کرا سکتی ہے اور ہم اب مغربی پاکستان والوں سے تنگ آ گئی ہیں۔ بعد میں میں نے دوسری عورت سے اس لڑکی کے بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ مولانا بھاشانی کے رشتہ داروں میں سے ہے۔ ۱۵ سال پہلے اسلام، اسلامی قومیت، مساوات کا بڑا شور تھا۔ اب اس کی جگہ بنگلہ ماں، بنگلہ قومیت اور بنگلہ آزادی نے لے لی ہے۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں اور بے روزگار لوگوں کو میں نے ہر دن جلوس نکالتے اور نعرہ لگاتے دیکھا۔ اس میں جے بنگلہ، سوادھن بنگلہ دیش والے نعرے لگائے جاتے تھے۔ ۱۵ سال پہلے ایسی باتیں ہرگز نہیں تھیں اور یہ سب شیخ مجیب الرحمٰن کی وجہ سے دیکھنے میں آ رہی ہیں"۔

یہ داستان کسی تبصرہ کی محتاج نہیں!

(۰)

تیسرا باب۔ سات سمندر پار سے

سنڈے ٹائمز لندن کا مشہور اخبار ہے۔ اس کے نامہ نگار خصوصی، انتھونی میسکارنہاس (ANTHONY MASCARENHAS) نے مشرقی پاکستان میں دس دن گزارنے کے بعد ان واقعات اور حوادث کی ایک تفصیلی رپورٹ مرتب کی جو گزشتہ مارچ۔ اپریل میں وہاں رونما ہوئے۔ یہ رپورٹ اس اخبار کی ۱۳ جون کی اشاعت میں شائع ہوئی ہے۔ جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول میں یہ بتایا گیا ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کی (کالعدم) عوامی لیگ نے پاکستان کو (بزعم خویش) ختم کرنے کے لئے کیا منصوبہ تیار کیا تھا اور پاکستان کی افواج نے کس مستعدی اور جانفشانی سے ناکام بنا دیا۔ حصہ دوم میں اس سبعیت و بربریت اور انسانیت سوز سفاکی و قصابی کے لرزہ انگیز واقعات مذکور ہیں۔ جن کی وہاں عام نمائش کی گئی۔ ہم اس رپورٹ کے حصہ اول کو تو درج ذیل کرتے ہیں لیکن حصہ دوم کی تفاصیل کو حذف کرنا قرین مصلحت سمجھتے ہیں کہ ان کے منظر عام پر لانے کا یہ موقعہ نہیں۔ اس سلسلہ میں ہم صرف اتنا سا کہنا چاہتے ہیں کہ ان واقعات کو "بنگالی اور غیر بنگالی" کے تصادم سے

تعبیر کرنا حقیقت سے چشم پوشی کے مرادف ہوگا۔ اصل یہ ہے کہ جب، جہاں اور جس قوم میں بھی لاقانونیت کو عام کیا جائے گا، وہاں اسی قسم کے واقعات رونما ہوں گے۔ ہوتا یہ ہے کہ چند افراد اپنے مخصوص مذموم مقاصد کے حصول کے لئے، انسانوں کے گروہوں میں نفرت کی آگ بھڑکاتے ہیں، اور جب یہ آگ عام ہو جاتی ہے تو انسان، انسان نہیں رہتا، درندہ بن جاتا ہے۔ اس وقت وہ ہر اس فرد یا گروہ کے ساتھ جسے وہ اپنا مخالف سمجھتا ہے، وہی کچھ کرتا ہے جو کچھ مشرقی پاکستان میں ہوا۔ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ ملک میں لاقانونیت کے رجحان کو روکا جائے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ جب ۱۹۶۹ء میں مغربی پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کے نام پر لاقانونیت پھیلائی گئی تو ہم نے اربابِ وطن کو بار بار متنبہ کیا تھا کہ یہ کھیل اچھا نہیں۔ قوم نے اگر یہ روش سیکھ لی تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ جو کچھ مشرقی پاکستان میں ہوا وہ اسی ابتداء کی انتہا تھی۔ خدا کرے کہ یہ "انتہا" ہی ثابت ہو، اور اس کے بعد آگ اور خون کی یہ ہولی کہیں بھی نہ کھیلی جائے۔

اب آپ سنڈے ٹائمز میں شائع شدہ رپورٹ ملاحظہ فرمائیے۔

"ڈھاکہ سے اسی میل دور، جانب مشرق، کومیلا کے مقام پر پاکستان آرمی کا ڈویژنل ہیڈ کوارٹر ہے۔ اس کے اپریشن روم میں، آپ کو، سرخ روشنائی سے جلی حروف میں لکھا ہوا حسبِ ذیل کتبہ نظر آئے گا۔

"جو شخص اپنے رازوں کی حفاظت کرتا ہے، بلند مقصد کو پا لیتا ہے۔"

ظاہر ہے کہ یہ بلند مقصد، پاکستان کی وحدت و سالمیت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، لیکن سب سے بڑا راز جسے پاکستانی فوج اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہے، بغاوت اور قتل و غارتگری کا وہ ناقابلِ یقین حزنیہ ہے جو مشرقی پاکستان میں ۲۵-۲۶ مارچ کو، رونما ہوا۔ اس راز کو وہ اس لئے پوشیدہ رکھ رہی ہے کہ اس سے کہیں مغربی پاکستان میں انتقام کی آگ نہ بھڑک اٹھے۔ نیز اس لئے بھی کہ اس خونچکاں حادثہ سے خود اسے بھی تو سخت دھچکا لگا ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے (یعنی گزشتہ مارچ۔ اپریل میں) جب بنگال آرمی کی تربیت یافتہ اور مسلح یونٹوں، نیم فوجی دستوں اور پولیس کے سپاہیوں، عوامی لیگ کے مسلح ممبروں اور طالب علموں پر مشتمل، ایک لاکھ چھہتر ہزار کی جمعیت نے متحدہ محاذ بنا لیا تھا تاکہ وہ شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ کے اس نعرہ کو عملی شکل دے سکیں ــــ "بنگلہ دیش خالی کرو۔ پنجابی کو مار دو۔"

مشرقی پاکستان کے دس روزہ دورہ سے میں نے جو تفاصیل جمع اور مرتب کی ہیں، ان سے یہ حقیقت سامنے آ جاتی ہے کہ پاکستانی فوج (یعنی بنگالیوں پر مشتمل فوج) نے نہایت وسیع پیمانے پر بغاوت کی جو قریب کامیاب ہو گئی تھی اور غیر بنگالی مردوں، عورتوں اور بچوں کو نہایت وحشیانہ طریق سے قتل کیا گیا۔ مشرقی پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں اب تک بیس ہزار سے زیادہ لاشیں پائی گئی ہیں لیکن اس قتل و غارتگری کے مکمل اعداد و شمار سے یہ تعداد ایک لاکھ سے بھی متجاوز ہو سکتی ہے۔

یہ پاکستانی فوج کی بجلی کی سی مستعدی، نہایت محکم ڈسپلن اور بہترین قیادت کا صدقہ تھا کہ یہ مملکت اس تباہی سے بچ نکلی جس نے اسے اس وقت چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ جب جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب، شیخ مجیب الرحمٰن کا، صدر یحییٰ اور مغربی پاکستان کے لیڈروں کے ساتھ طویل مذاکرہ ناکام رہ گیا تھا، پاکستانی فوج نے جو قیدی گرفتار کئے، ان کے بیانات سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ شیخ مجیب الرحمٰن اور اس کے ساتھیوں نے اس موقعہ کے لئے کس قدر خطرناک پروگرام مرتب کر رکھا تھا۔

"بنگلہ دیش" کے حامیوں کا پروگرام یہ تھا کہ ۲۶ مارچ کو بعد نماز جمعہ "بنگلہ دیش" کی آزاد مملکت کا اعلان کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے ان کی اسکیم یہ تھی کہ چاٹگانگ کی بندرگاہ اور ڈھاکہ کے ہوائی اڈہ کو اپنے قبضہ میں لے لیا جائے تاکہ مغربی پاکستان سے سلسلہ مواصلات اور آمد و رفت منقطع ہو جائے اور مغربی پاکستان کے فوجی افسروں کو تہ تیغ کر دیا جائے۔ ان کے منصوبے کا دوسرا مرحلہ یہ تھا کہ پلوں اور ریل کی پٹڑیوں کو تباہ کر دیا جائے تاکہ فوجی دستے نقل و حرکت نہ کر سکیں اور اس کے بعد پاکستانی فوج جس جس چھاؤنی میں ہو اسے وہیں کا وہیں ختم کر دیا جائے۔ اسکیم میں یہ بھی شامل تھا کہ فوجی افسروں کے بیوی بچوں کو بطور یرغمال محصور رکھا جائے تاکہ ایک تو باغیوں کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہ کی جا سکے اور دوسرے مغربی پاکستان میں رہنے والے بنگالیوں کا ان سے تبادلہ کیا جا سکے۔

اس وقت مشرقی پاکستان میں کل ایک ڈویژن فوج مقیم تھی جو پندرہ بٹالین پر مشتمل تھی۔ یہ فوج اضلاعی چھاؤنیوں اور سرحدی علاقہ میں بکھری پڑی تھی۔ ان پندرہ بٹالین میں سے نو بٹالین مغربی پاکستان سے متعلق تھیں اور باقی چھ بٹالین ایسٹ بنگال رجمنٹ پر مشتمل تھیں جن کے سپاہی بنگالی تھے۔ اور یہاں وہاں افسر پنجابی۔ یعنی صورت حال یہ تھی کہ دس ہزار مغربی پاکستان کی فوج کے مقابلہ میں ایسٹ بنگال رجمنٹ کے تین ہزار سپاہی۔ ایسٹ پاکستان رائفلز کے چودہ ہزار مکمل تربیت یافتہ اور مسلح فوجی۔ چالیس ہزار پولیس کے افسر اور جوان۔ اور ایک لاکھ وہ انصار اور مجاہدین صف آرا تھے جنہیں پاکستانی فوج نے سرحدات کی حفاظت کے لئے متعین کر رکھا تھا۔ ایک لاکھ چھہتر ہزار (ستاون ہزار؟) افراد پر مشتمل یہ فوج مارٹر توپوں، بے آواز رائفلوں، ہلکی اور بھاری مشین گنوں اور روڈ ٹرانسپورٹ سے لیس تھی۔ اس سامان کا بیشتر حصہ تو ان کا اپنا تھا لیکن بعد میں پاکستانی فوج کے ہاتھ میں جو اسلحہ آیا اس پر بھارتی اسلحہ ساز فیکٹریوں اور دوسرے بیرونی ممالک کے نشانات موجود تھے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ ان باغیوں کو بھارتی سرحد کے اُس پار سے اسلحہ مہیا کیا جا رہا تھا۔

چاٹگانگ کے قریب رنگ متی کے سرحدی ضلع کے ڈپٹی کمشنر کے دفتر سے، پاکستانی فوج کو جو دستاویزات ملیں ان سے معلوم ہوا کہ اس افسر کا، سرحد کے پار بھارتی بریگیڈ کمانڈر سے گہرا رابطہ تھا۔ بنگالی افواج، ۲۶ مارچ کو "بنگلہ دیش کی آزادی کے لئے" پاکستان کے وجود پر ضرب کاری لگانے کے لئے ہر طرح منظم اور تیار کر دی گئی تھیں۔ شواہد سے مترشح ہوتا ہے کہ اس حملہ کے لئے تین بجے شب کا وقت طے کیا گیا تھا۔ لیکن پاکستانی افواج نے اس کا سراغ پا لیا اور چند گھنٹے پہلے پیش قدمی کر کے ان کے منصوبوں کو خاک میں ملا کر رکھ دیا۔ ۲۵-۲۶ مارچ کی درمیانی شب کو پاکستانی فوج کے یونٹ ڈھاکہ میں پھیل گئے۔ انہوں نے ایسٹ پاکستان رائفلز کے ہیڈ کوارٹرز، ایسٹ بنگال رجمنٹ کے مرکز اور پولیس کی بارکوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا، ان پر حملہ کیا اور آن کی آن میں، ان کی کمر توڑ ڈالی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ باغی افواج کے افراد یا تو مارے گئے اور یا گرفتار کر لئے گئے۔ ان کی عمارات پر بڑے بڑے شگاف آج بھی اُس رات کی کارروائی کی زندہ شہادت ہیں۔ اس (برق آسا، بروقت) اقدام سے، ڈھاکہ کا رشتہ مغربی پاکستان سے منقطع ہونے سے بچ گیا اور فوجی پروازوں کا سلسلہ برقرار رہا۔

چاٹگانگ میں متعین مغربی پاکستان کے افسروں نے خطرہ کو بھانپ کر بنگالی فوجیوں کو بحری جہازوں اور توپوں سے دور ساحل سمندر پر منتقل کر دیا۔ اس کے بعد ان افسروں نے دیگر ملٹری یونٹوں سے رابطہ قائم کیا اور اس طرح چاٹگانگ کی بندرگاہ، ہوائی اڈے اور شہر کو جانے والے راستوں پر قبضہ کر لیا۔ ایسٹ پاکستان رائفلز اور ایسٹ بنگال رجمنٹ

کے سپاہیوں نے اپنے آپ کو چٹاگانگ میں محصور کر لیا تھا۔ وہاں اس لڑائی کا سلسلہ قریب دس دن تک جاری رہا۔

بری اور بحری فوج کے ان اقدامات سے یہ تو ہوا کہ ڈھاکہ اور چٹاگانگ کا رشتہ مغربی پاکستان سے منقطع نہ ہونے پایا، لیکن غیر بنگالیوں کے قتل عام کا جو سلسلہ پورے مشرقی پاکستان میں پھیل رہا تھا، اس کا (فوری طور پر) روکنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ میں نے قتل اور غارت گری کے واقعات کی شہادت کے لئے اسی سے زیادہ انٹرویو لئے۔ ان سے لوٹ مار، عصمت دری، انتہائی سفاکی سے اذیتیں دے دیکر قتل کرنے کی جو لرزہ انگیز داستانیں مجھ تک پہنچیں (وہ ناقابل بیان ہیں)۔

(اس کے بعد اس نامہ نگار نے ان انسانیت سوز، وحشت و درندگی کی تفاصیل دی ہیں جنہیں اس محشرستان میں عام کیا گیا۔ لیکن جیسا کہ ہم نے ابتداء لکھا ہے، ہم انہیں درج کرنا قرین مصلحت نہیں سمجھتے۔ اس کے بعد اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ)

(اس قسم کے واقعات تو بے شمار ہونگے لیکن) حکومت پاکستان نے، اس اندیشہ کے ماتحت کہ اس سے کہیں مغربی پاکستان میں انتقام کی آگ نہ بھڑک اٹھے، ان لرزہ انگیز واقعات کو منظر عام پر لانے سے احتراز برتا ہے۔ مشرقی پاکستان سے آنے والے پسماندگان جو بحری راستے سے کراچی آتے ہیں، انہیں رات کی تاریکی میں، انتہائی حفاظتی اقدامات کے ساتھ ساحل پر اتارا جاتا ہے۔ خود فوج بھی اس بغاوت کا ذکر نہیں کرتی حالانکہ وہ ابھی اس کی لگائی ہوئی آگ کے فرو کرنے میں ہمہ تن مصروف ہے۔"

(شائع شدہ ۱۳ مئی ۱۹۷۱ء)

(۵)

حکومت سے گذارش

بھارتی حکومت مشرقی پاکستان کے واقعات کو غلط رنگ میں پیش کر کے دنیا میں جس قدر پراپیگنڈہ کر رہی ہے وہ ظاہر ہے۔ اس نے اسی پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ مسٹر جے پرکاش نرائن کو اپنے خصوصی ترجمان کی حیثیت سے عرب ممالک میں بھیجا کہ وہ انہیں پاکستان کے خلاف بھڑکائے۔ اس کاوش کے ناکام رہ جانے کے بعد اب بھارتی حکومت مختلف ممالک میں اپنے مختلف مشن بھیج رہی ہے جو وہاں جا کر معلوم کس کس قسم کی سیاہ تصویریں پیش کرینگے۔ اس پراپیگنڈے کے مضرت رساں اثرات کو زائل کرنے کے لئے اشد ضروری ہے کہ حکومت پاکستان کی طرف سے صحیح واقعات پر مشتمل ایک مفصل قرطاس ابیض شائع ہو اور اسے ساری دنیا میں بڑے وسیع پیمانے پر پھیلایا جائے۔ اس میں شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے رفقاء کی سازش، ہندوستان کی طرف سے اس سازش کی عملی حمایت اور اس سلسلہ میں، باغیوں کی طرف سے جس قدر لرزہ انگیز مظالم روا رکھے گئے، ان سب کا تفصیلی ذکر ہونا چاہیئے۔ اصل یہ ہے کہ ہمارے ہاں شروع ہی سے یہ ہو رہا ہے کہ ہندوستان جھوٹے پراپیگنڈہ سے اقوام عالم کو ہماری طرف سے بدگمان کئے چلا جا رہا ہے اور ہم اپنی سچی بات بھی ان لوگوں تک نہیں پہنچاتے۔ اس کا جو نتیجہ ہے، وہ ظاہر ہے۔ ہمیں امید واثق ہے کہ حکومت پاکستان اس باب میں موثر ترین اقدامات کریگی۔

(۱۲)

اسکا سہرا بھی فوج ہی کے سر بندھا

دنیا میں عام مملکتوں کی بنیاد سیاسی، اقتصادی، جغرافیائی (وطنی)، نسلی یا قومی ہوتی ہے۔ لیکن مملکتِ پاکستان کی بنیاد ان سب سے نرالی ہے۔ یہ بنیاد دینی ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے:

(۱) اسلام ایک مذہب نہیں بلکہ دین (نظامِ حیات) ہے۔ اس دین کے حقیقت ثابتہ بننے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے ماننے والوں کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں قرآن کریم کے احکام و اصول مملکت کے قوانین کی حیثیت سے نافذ ہوں اور مناسب تعلیم و تربیت سے ایسی فضا پیدا کی جائے جس میں تمام افراد کی سیرت و کردار قرآنی قالب میں ڈھل سکیں۔

(۲) قومیت کا معیار ایمان کا اشتراک ہو۔ یعنی اس مملکت (بلکہ ساری دنیا) میں بسنے والے مسلمان، بلا لحاظ رنگ، نسل، زبان، جغرافیائی حدود، ایک قوم کے افراد ہوں اور غیر مسلم ایک دوسری قوم کے افراد۔ جو کاروبارِ مملکت میں حصہ لینے کے اہل قرار نہیں دیئے جا سکتے۔

ان دونوں شقوں کے مجموعہ کا نام "نظریہ پاکستان" ہے، جو مطالبۂ پاکستان کی بنیاد تھی اور اب مملکتِ پاکستان کی اساس و بنیاد ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی مملکت کے کسی باشندے کو اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ اس مملکت کی اساس و بنیاد کے خلاف کچھ کہے یا کرے۔ ایسا کرنا اس مملکت کے خلاف بغاوت کے مرادف ہوگا۔

اس بنا پر ہم روزِ اول سے کہتے چلے آ رہے ہیں کہ نظریہ پاکستان کے خلاف کچھ کہنا یا کوئی عملی قدم اٹھانا، قانوناً جرم قرار دیا جانا چاہیئے۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ کسی حکومت نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ اس کا نتیجہ جو ہوا، المیۂ مشرقی پاکستان اسکی خونی شہادت ہے۔

مقامِ مسرت ہے کہ جو کچھ تئیس سال میں کسی حکومت سے نہ ہو سکا، اس کی سعادت موجودہ عسکری نظام کو حاصل ہوئی۔ اور وہ بھی اس کی ایک جزوی تنظیم — سب مارشل لاء ایڈمنسٹریشن زون سی (لاہور) کی ایک فوجی عدالت کو۔ اس عدالت نے حال ہی میں مسٹر عبداللہ ملک، مدیر روزنامہ آزاد کے خلاف مقدمہ میں جو فیصلہ دیا ہے اس کی بنیاد اسی پر ہے۔ اس مقدمہ کی مکمل روئیداد ہمارے سامنے نہیں۔ روزنامہ امروز (لاہور) نے اپنی ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں لکھا ہے کہ:

> عدالت نے عبداللہ ملک سے سوال کیا کہ آپ کے نزدیک نظریۂ پاکستان اور پاکستان کے حصول کا مقصد کیا تھا۔ اس پر عبداللہ ملک نے کہا کہ اس وقت مسلمان پسے ہوئے تھے اور ان کا تصور یہ تھا کہ انہیں ایک ایسا ملک ملے گا جس میں ہمارے دکھوں کا مداوا ہوگا اور ہماری ضروریات پوری ہوں گی۔ لیکن گزشتہ ۲۳ برس میں اسلام

اور نظریۂ پاکستان کے نام پر غریب عوام کا استحصال ہوتا رہا ہے۔

اس کے بعد عدالت کا فیصلہ ہمارے سامنے آتا ہے جس کا متن (جیسا کہ روزنامہ امروز کی ۲۵ جون کی اشاعت میں شائع ہوا ہے) حسب ذیل ہے۔ (واضح رہے کہ ہم عبداللہ ملک کے کیس کے متعلق بات نہیں کر رہے۔ اس کے حوالے سے اصولی گفتگو کر رہے ہیں)

"عدالت نے استغاثہ اور صفائی کے گواہان کی شہادت پر غور و خوض کے بعد نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مسٹر عبداللہ ملک ملزم حاضر بعدالت پر فرد جرم میں عاید کردہ دونوں الزامات کی سرزدگی ثابت ہوتی ہے۔ اس طرح وہ مارشل ریگولیشن نمبر ۱ اور مارشل لاء ریگولیشن نمبر ۲ کی خلاف ورزی کے مرتکب قرار دیئے جاتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ملزم کے لئے سزا کا تعین کیا جائے یہ مناسب خیال کیا جاتا ہے کہ ان کے جرم کی شدت کو نظریۂ پاکستان کے پس منظر میں دیکھا جائے جو نظریہ بانیٔ ملک قائداعظم محمد علی جناح نے قوم کے سامنے وقتاً فوقتاً حصولِ مملکتِ پاکستان سے پہلے اور بعد میں پیش کیا۔ وہ آپ کے خطبات سے عیاں ہے۔ یہاں آپ کے ارشادات کا حوالہ ضروری ہے۔

آپ نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو فرمایا۔ "پاکستان اسی دن وجود میں آ گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔ تقسیم ہند کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی وجہ نہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہے، نہ انگریزوں کی چال۔ یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ ہے۔" اسلامیہ کالج پشاور میں ۱۳ جنوری ۱۹۴۸ء کو ارشاد فرمایا۔ "ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک زمین کا ٹکڑا حاصل کرنے کے لئے نہیں کیا تھا۔ بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ چاہتے تھے جہاں اسلام کے اصولوں کو جاری و نافذ کیا جا سکے۔"

شاہی دربار سبی میں ۱۴ فروری ۱۹۴۸ء کو فرمایا: "میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات قانون عطا کرنے والے پیغمبر اسلام کے اسوۂ حسنہ کے اتباع میں ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ اپنی جمہوریت کی بنیادیں صحیح اسلامی تصورات اور اصولوں پر استوار کریں۔"

بار ایسوسی ایشن کراچی میں ۲۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "ہمیں پاکستان کا حق ادا کرنا چاہیئے۔ اس کی بے غرض خدمت کرنی چاہیئے، اس کی خاطر قربانیاں دینی چاہئیں اور اگر ضرورت پڑے تو اپنی جان تک نچھاور کر دینی چاہیئے تاکہ یہ ایک شاندار، عظیم اور خوشحال مملکت بن جائے۔"

اجلاس مسلم لیگ کراچی ۱۹۴۳ء میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "وہ کونسا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے والے تمام مسلمان جسدِ واحد کی مانند ہیں۔ وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے؟ وہ کون سا لنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے۔ وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر خدا کی کتاب قرآن کریم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے، ہم میں زیادہ سے زیادہ اتحاد پیدا ہوتا جائیگا۔ ایک رسول، ایک کتاب، ایک امت۔"

پاکستان کی پہلی سالگرہ ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء کے موقع پر۔ "قیام پاکستان کا واقعہ تاریخ کا عدیم المثال واقعہ ہے۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت ہے۔ اگر ہم نے دیانتداری، تندہی اور بے غرضی کے ساتھ کام کیا تو یہ مملکت عظیم الشان ترقی سے بہرہ مند ہوگی۔ مجھے اپنے عوام پر مکمل بھروسہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ہر موقع پر اسلام کی تاریخ، عظمت و شوکت اور روایات کے مطابق عمل پیرا ہوں گے۔"

۱۹ فروری ۱۹۴۸ء "مغربی پاکستان مشرقی پاکستان سے تقریباً ایک ہزار میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور درمیان میں ہندوستان کا علاقہ ہے۔ ایک بیرونِ ملک کے طالب علم کے ذہن میں سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوگا کہ ایسا کیونکر ممکن ہے کہ اتنے دور دراز

فاصلوں پر واقع صوبوں کی حکومتوں میں وحدت اور ہم آہنگی کیونکر پیدا ہو سکتی ہے۔ میں اس سوال کا جواب صرف ایک لفظ میں دے سکتا ہوں۔ وہ چیز ایمان ہے۔ اللہ پر ہمارا ایمان، اپنی ذات پر ہمارا ایمان، اپنی تقدیر پر ہمارا ایمان۔ ہم ہر حال ...... میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ منتشر ہو گئے تو بگڑ جائیں گے اور متحد رہو گے تو کھڑے رہو گے۔"

قوم کے عظیم رہنما اور محسن اعظم کے اقوال سے اور برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کے حقائق سے ظاہر ہے کہ پاکستان کا مطالبہ دو قومی نظریہ کی بنیاد پر کیا گیا اور اسی احساس پر مملکت خداداد پاکستان وجود میں آئی۔ تاکہ برصغیر کے مسلمان ایک علیحدہ قوم کی حیثیت سے اپنے مذہب اور تہذیب و تمدن کے مطابق ایک علیحدہ آزاد ملک میں زندگی بسر کر سکیں۔ بابائے قوم نے پاکستان کی سالمیت و بقا اور قومی یکجہتی پر واضح ترین الفاظ میں ہمیشہ زور دیا کیونکہ یہی عناصر پاک مملکت اور پاکستانی قوم کی بقا اور ترقی کے ضامن ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قوم کے افراد یا مختلف طبقات میں انتشار پھیلانے اور مادر وطن کے دونوں حصوں کے درمیان منافرت کی فضا پیدا کرنے کی کوشش پاکستان کی یکجہتی اور قومی ترقی و خوشحالی کے منافی ہے۔

پاکستان کی اکثریتی مسلمان آبادی خواہ وہ کسی صوبہ میں آباد کیوں نہ ہو اور ان کے درمیان کتنا ہی جغرافیائی فاصلہ کیوں نہ ہو اسلام اور جذبۂ ایمان کی لڑی میں منسلک ہیں۔ یہی جذبۂ ایمانی اور راہ راست پر ایقان کا زور تھا جس نے حضرت نوح کو اپنے فرزند اور حضرت لوط کو اپنی اہلیہ اور حضرت ابراہیم کو اپنے والد سے جدا ہونے پر مجبور کیا۔ اسی جذبۂ ایمان کی خاطر رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اپنے عزیز و اقرباء سے جنگ بدر میں نبرد آزما ہوئے۔ ان مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ قوم اور ملت کے رہنماؤں اور پیشواؤں نے قومی اور ملی سالمیت و استحکام کے لئے نہ صرف قربانیاں دیں بلکہ انتشار پسند عناصر کے خلاف کارفرما بھی ہوئے۔ یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ جس طرح مسلمانوں کے لئے اسلام کے پانچ ستون خدا تعالے کی وحدانیت۔ رسول اکرم کی نبوت، ملائکہ اور یوم آخرت پر یقین اور کلام الٰہی پر ایمان اور عمل لازم ہیں، اسی طرح پاک مملکت کے ہر فرد پر پاکستان کی بقا، سالمیت استحکام اور قومی یکجہتی جذبہ ایمان کی حیثیت کے طور پر لازم آتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہر وہ قول و فعل جو فتنہ انتشار کو پھیلانے اور نفرت کی فضا کو پیدا کرنے کی غرض سے کہا یا کیا گیا ہو، اس کو سختی سے دبا دیا جائے۔ قائداعظم قوم کے لئے جو مطمح عمل اپنے الفاظ اتحاد، یقین محکم اور تنظیم میں چھوڑ گئے ہیں ان کی برقراری اور ان پر عمل ہم سب کا من حیث القوم فرض اولین ہے۔

ملزم عبداللہ ملک تعلیم یافتہ، باشعور اور ذمہ دار فرد ہیں۔ مغربی پاکستان کے ایک روزنامہ اخبار کی مجلس ادارت کے رکن بھی ہیں۔ یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ یوم اقبال جیسی اہم تقریب کے سلسلے میں طلباء کے جلسہ میں سربراہ مملکت کے خلاف نازیبا الفاظ کے استعمال اور پاکستان کے موجودہ نازک دور میں صوبائی تعصب اور منافرت و انتشار کو ہوا دینے کی معاونت میں قابل اعتراض جملہ کے اظہار کے رد عمل کا ان کو احساس نہ ہو۔ ان جیسی قابلیت اور اہلیت کے حامل شخص کو قطعی علم ہوگا کہ ان کے یہ الفاظ عوام الناس میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی طرف نفرت پیدا کر دیں گے اور افراد قوم میں ہراس اور بے چینی، مایوسی اور غیر یقینی کے موجب ہونگے۔

وجہ بنا ملزم عبداللہ ملک نرمی کے مستحق نہیں۔ اس لئے ان کو ایک سال قید بامشقت اور پچاس ہزار روپے جرمانہ کی سزا دی جاتی ہے۔ ملزم کے معمر ہونے کی وجہ سے کوڑوں کی سزا نہیں دی جا رہی۔ فیصلہ اور سزا کا اعلان بہ اجلاس عدالت بتاریخ ۲۸ مئی سنہ ۱۹۷۱ء کو کیا گیا۔"

(باقی صفحہ پر)

حقائق و عبر

۱۔ تقسیمِ بنگال

حکومتِ ہند کے ایک سابقہ سکریٹری شعبۂ دفاع نے گذشتہ اپریل میں کہا کہ مشرقی پاکستان میں جو حالات رونما ہوئے ہیں، ہندوستان کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے اور مغربی اور مشرقی بنگال کو پھر سے متحد کر کے، ایک وفاق میں منسلک کر دینا چاہیئے۔ تقسیم بنگال ایک مصنوعی اقدام تھا (جسے ختم کر دینا چاہیئے) یہی تجویز اس سے پہلے ہندوستان کے 'ڈائرکٹر آف دی انسٹی ٹیوشن آف ڈیفنس سٹڈیز، مسٹر سبرا مانیم' نے پیش کی تھی۔ (پاکستان ٹائمز۔ ۲۰ اپریل ۱۹۷۱ء)

ہندو کے دل میں یہ کسک آج کی نہیں، بہت پرانی ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد حکومت میں، ہندوستان مختلف صوبوں میں منقسم تھا۔ جسے بعد میں صوبہ بنگال کہا گیا اس میں بنگال۔ آسام۔ بہار اور اڑیسہ شامل تھے، اور دارالخلافہ کلکتہ تھا۔ اس صوبہ کا رقبہ (۱،۸۹،۰۰۰) مربع میل تھا اور آبادی (اس زمانے میں) سات کروڑ اسّی لاکھ۔ ۱۸۵۳ء سے لے کر ۱۹۰۲ء تک مختلف لفٹننٹ گورنرز چیختے رہے کہ اتنے بڑے صوبہ کا انتظام کرنا ان کے لئے ناممکن ہے۔ اسے مختلف صوبوں میں تقسیم کرنا چاہیئے۔ خدا خدا کر کے ان کی یہ پکار سنی گئی اور ۱۹۰۵ء میں یہ وسیع و عریض خطہ دو صوبوں میں تقسیم ہو گیا —— ایک مغربی بنگال جس کا رقبہ (۱،۴۱،۵۸۰) مربع میل تھا اور آبادی پانچ کروڑ چالیس لاکھ جس میں چار کروڑ بیس لاکھ ہندو تھے اور نوّے لاکھ مسلمان۔ دوسرا صوبہ مشرقی بنگال جس کا رقبہ (۱،۰۶،۵۴۰) مربع میل تھا اور آبادی تین کروڑ دس لاکھ، جس میں ایک کروڑ اسّی لاکھ مسلمان تھے اور ایک کروڑ بیس لاکھ ہندو۔ یعنی اس تقسیم کی رُو سے، جو محض انتظامی سہولتوں کے لئے عمل میں لائی گئی تھی، مشرقی بنگال میں، مسلمانوں کی آبادی بقدر ساٹھ لاکھ کے زیادہ تھی —— اور یہی چیز ہندو کے دل میں آگ بھڑکانے کا موجب بن گئی۔ اس نے اس (تقسیم) کے خلاف قیامت برپا کر دی۔ اس مخالفت میں انڈین نیشنل کانگریس، جس کا دعویٰ تھا کہ وہ ہندوستان کے تمام باشندوں (ہندوؤں۔ مسلمانوں، سب) کی نمائندہ جماعت ہے، پیش پیش تھی۔ اس کی وجہ، قاسم بازار کے مہاراجہ مہندرا چندر نندی کے الفاظ میں یہ تھی کہ

نئے صوبے میں مسلمانوں کی آبادی اکثریت میں ہو گی اور بنگالی ہندو اقلیت میں رہ جائیں گے۔ اس طرح ہم خود اپنے ملک میں اجنبی بن کر رہ جائیں گے۔ میں جب اس امر پر غور کرتا ہوں کہ اس سے ہماری نسل کا مستقبل کیا ہو گا، تو مجھ پر کپکپی چھا جاتی ہے۔

ہندوؤں نے اس مخالفت کا طوفان مسلسل جاری رکھا تا آنکہ انگریزی حکومت نے ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء کو شاہنشاہ جارج پنجم نے اپنی تاج پوشی کی تقریب پر دہلی میں بنفسِ نفیس اس کی تنسیخ کا اعلان فرما دیا اور مسلمان چیختے ہی رہ گئے۔ ہندوؤں نے اس پر فتح کے شادیانے بجائے اور سرکارِ انگلشیہ کی شان میں حمد و ستائش کے قصیدے پڑھے۔ مشرقی بنگال کے مختصر سے علاقہ کے مسلمان جنہیں ذرا آنکھ کھولنے کا موقع میسر آیا تھا، پھر ہندوؤں کے شکنجے میں جکڑ دیئے گئے۔

تقسیمِ ہند کے موقع پر طے شدہ اصولوں کے مطابق، پورے کے پورے بنگال کو پاکستان کا حصہ بننا تھا لیکن انگریز اور ہندو کی سازش سے اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا اور اس کے مختصر سے حصے میں پھر مسلمانوں کی اکثریت ہو گئی ہندو نے یہ تقسیم ایک سازش کے ماتحت خود کرائی تھی لیکن یہ دیکھ کر کہ ایک مختصر سے حصے ہی میں سہی مسلمان پھر اکثریت میں ہو گئے ہیں، ان کے سینے پر سانپ لوٹتا تھا۔ وہ مسلسل تئیس سال سے اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ یہ حصہ پھر سے مغربی بنگال میں مدغم ہو جائے۔ بالآخر انہیں مسلمانوں میں سے "جعفر" ایک بار پھر مل گئے اور ان دونوں نے مل کر ہندو کے مشئوم عزائم کو کامیاب بنانے کے لئے بڑی گہری چال چلی۔ یہ تو دعا دیجئے پاکستان کی افواجِ قاہرہ کو جنہوں نے جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کی طرح بے لوث قربانیوں سے اس مہیب سازش کو ناکام بنا دیا ورنہ ہندو نے تو جشن منانے کے لئے اپنے چراغوں میں تیل اور بتی ڈال ہی دی تھی۔

یہ ہے قصہ تقسیمِ بنگال کا ـــــ لیکن جس طرح تنسیخِ تقسیمِ بنگال، آخرالامر ہندوستان کی تقسیم پر منتج ہوئی تھی، اگر ہم نے، اپنے انہی اسلاف کی روش اختیار کی جنہوں نے اس تنسیخ سے متاثر ہو کر اپنی تنظیم کے لئے مسلسل جہاد شروع کر دیا تھا، تو عجب نہیں کہ مغربی بنگال خود پاکستان کا حصہ بن جائے ـــــ بات ساری ہمارے ہمت کرنے کی ہے۔

⁂

۲- انڈین نیشنلزم کی بنیاد

ہم سے یہ سوال اکثر پوچھا جاتا ہے کہ ہندوؤں کا دعوےٰ یہ ہے کہ۔

(۱) ہندوستان میں حکومت مذہبی نہیں، سیکولر ہے۔ اور

(۲) ہندوستان کے سب باشندے، بلا لحاظِ مذہب، ایک قوم کے افراد ہیں۔

دنیا میں بیشتر ممالک ایسے ہیں جن میں حکومت کا انداز سیکولر ہے اور قومیت کا معیار، وطنیت۔ لیکن وہاں یہ نہیں ہوتا کہ اس قوم اور مملکت کے ایک مذہب کے پیرو، مستقلاً دوسرے مذہب کے پیروؤں کے خون کے پیاسے ہوں اور انہیں ختم کرنے کی فکر میں ہوں۔ سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں ہندو ایسا کیوں کرتا ہے؟

طلوعِ اسلام

یہ اس لئے کہ ہندو منافق ہے۔ اس کے یہ دونوں دعاوی غلط ہیں۔ نہ وہاں کی حکومت سیکولر ہے اور نہ وہاں نسبتاً ہی قومیت کا معیار وطنیت۔ وہاں ہندو مذہب کی حکومت ہے اور ہندو، کسی مسلمان کو اپنی قوم کا فرد نہیں سمجھتا۔ ہندو قومیت کی بنیاد مذہب پر ہے۔ ہندوؤں کے ہاں 'مذہب کی بنیاد پر قومیت کا احساس' اٹھارویں صدی میں بیدار ہوا ۔۔۔ اور اس کی ابتدا بھی بنگال سے ہوئی جہاں "سنیاسی تحریک" نے سر اٹھایا۔ بنگال کے مشہور (اور سخت متعصب) ناول نویس، بنکم چیٹرجی نے اپنے ناول ۔۔ انند متھ ۔ میں اس تحریک کو بڑا اچھالا ہے۔ اس ناول کے آخری باب میں، اس کا ہیرو، اپنے متبعین سے کہتا ہے کہ

تمہارا کام اختتام تک پہنچ گیا۔ (ہندوستان میں) مسلمانوں کا اقتدار ختم ہو گیا۔ اب تمہارے لئے کچھ کرنے کا کام باقی نہیں رہا۔ اب ہمیں چاہیئے کہ انگریزوں کو حکومت قائم کرنے دیں۔ ان کے زیر اقتدار ہم لوگ بہت خوش رہیں گے۔ اس وقت تو انگریز صرف تاجر ہیں۔ انہیں صرف دولت سمیٹنے کی فکر ہے، حکومت کرنے کی نہیں۔ لیکن جب (بھارت ماتا کے بچے) بغاوت کریں گے تو انگریزوں کو حکومت قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوگی کیونکہ اس کے بغیر وہ دولت حاصل نہیں کر سکیں گے۔ ہماری بغاوت نے یہ کام کر دیا ہے اور انگریز نے تخت و تاج سنبھال لیا ہے۔ اب ہمارا دشمن کوئی نہیں۔ انگریز حاکم بھی ہیں اور ہمارے دوست بھی۔

"بندے ماترم" کا گیت انہی کا وضع کردہ ہے جو اب حکومت ہند کا قومی ترانہ ہے۔ ۱۸۶۷ء میں بنگال ہی کے ایک اور لیڈر ناباگوپال مترا نے ایک "ہندو میلہ" کی طرح ڈالی جس نے آہستہ آہستہ ایک اچھی خاصی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ بعد میں اسے "نیشنل سوسائٹی" کا نام دے دیا گیا۔ اس پر بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ جب یہ سوسائٹی خالصتہً ہندوؤں پر مشتمل ہے تو اسے "نیشنل" کیوں کہا جاتا ہے۔ اس کا جواب مترا نے ان الفاظ میں دیا:

ہم سمجھ نہیں سکے کہ اس سوسائٹی کے "نیشنل" کہلانے پر اعتراض کیوں کیا جاتا ہے۔ ہندو ایک قوم (نیشن) کا نام ہے اس لئے جو سوسائٹی ہندوؤں پر مشتمل ہوگی، اسے "نیشنل" نہیں کہا جائے گا تو اور کیا کہہ کر پکارا جائے گا؟

اس کے بعد ایک اور بنگالی ہندو، ماسٹر راج نرائن بوس نے ایک "نیشنل سوسائٹی" کی بنیاد رکھی جس کے ممبر صرف ہندو تھے، اور اس کا مقصد، ہندو مذہب کی افضلیت ثابت کرنا۔ بنکم چندر چیٹرجی نے "ہندو نیشنل تحریک" کے سلسلہ میں ۱۸۸۲ء میں لکھا:

مجھے وہ سب کچھ کرنا چاہیئے جس میں تمام ہندوؤں کا فائدہ ہو اور اس سے احتراز کرنا چاہیئے جس سے کسی ایک ہندو کا بھی نقصان ہوتا ہو۔ یہ اصول، نظریہ قومیت کا نصف ردل ہے۔

دنیا میں ہندوؤں کے علاوہ اور بھی متعدد قومیں ہیں۔ جو کچھ ان کے لئے نفع رساں ہے ضروری نہیں کہ ہندوؤں کے لئے بھی منفعت بخش ہو۔ ایسی صورت میں ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ ان لوگوں کو ان چیزوں سے محروم کر دیں جو ان کے لئے نفع رساں ہوں۔ اگر ایسا کرنے میں کسی قوم کو ظلم و استبداد کا نشانہ بھی بنانا پڑے تو ہمیں ایسا کرنے میں قطعاً جھجکنا نہیں چاہیئے۔ اسی طرح، یہ ممکن ہے کہ ہمیں

بات سے ہمیں فائدہ پہنچتا ہو وہ ان لوگوں کے لئے ضرر رساں ہو۔ اس کے باوجود، ہمیں اپنی قوم کے مفاد سے رکنا نہیں چاہیئے خواہ اس سے دوسروں کو کتنا ہی نقصان کیوں نہ پہنچے۔ یہ ہمارے نظریۂ قومیت کا دوسرا حصّہ ہے۔

اس کے بعد سوامی دیانند کی آریہ سماج تحریک شروع ہوئی جو تمام ہندوستان میں پھیل گئی۔ مشہور ہندو مؤرخ ڈاکٹر موجمدار اس تحریک کے متعلق لکھتا ہے۔

> آریہ سماج پہلے دن ہی سے ایک فوجی نوعیت کا فرقہ تھا۔ اس کا جذبۂ محرکہ "حب الوطنی" تھا لیکن اس "حب الوطنی" سے مفہوم یہ تھا کہ دیگر مذاہب، بالخصوص مسلمانوں کے مذہب، کو کسی صورت میں برداشت نہ کیا جائے۔ آریہ سماجی نوجوان اعلانیہ للکارتے رہتے تھے کہ وہ اس دن کا انتظار کر رہے ہیں جب وہ مسلمانوں اور انگریزوں، دونوں کے ساتھ سودا چکائیں گے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آریہ سماج کا مقصد یہ تھا کہ تمام ہندوستان میں ہندو مذہب اور ہندو کلچر کو غالب ٹھہرا کر "انڈین نیشن" تشکیل کی جائے۔ اس کے لئے انہوں نے شدھی کی تحریک کا آغاز کیا جس کے معنی یہ تھے کہ جن قوموں نے اس سے پہلے جبراً یا طوعاً ہندو مذہب کو خیرباد کہا تھا انہیں دوبارہ ہندو بنا لیا جائے۔

یہ تھا وہ تخم جس سے "انڈین نیشن" کا شجرۃ الزقوم برومند ہوا۔ یہی تھی وہ نیشن جس نے انڈین نیشنل کانگریس کا روپ دھارا، اور جس کے ممبر بننے میں (خیر سے) ہمارے بڑے بڑے جید علماء کرام نے فخر محسوس کیا۔ اسی کانگریس نے (مہاتما) گاندھی کی کوششوں سے بڑا فروغ حاصل کیا۔ اس سے مقصود کیا تھا، اس کے متعلق، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری، اچاریہ کرپلانی نے ۱۹۳۹ء میں کہا تھا کہ

> گاندھی جی نے کانگریس کو بتایا ہے کہ ہمارا کام صرف یہ نہیں کہ ملک کی سیاسی باگ ڈور انگریز کے ہاتھ سے چھین کر اہلِ ملک کے ہاتھ میں دیدیں۔ بلکہ سب سے ضروری یہ چیز ہے کہ ہم اپنی تمام جد و جہد کی بنیاد کسی ایسے فلسفۂ حیات پر رکھیں جس کے دائرے میں ہماری معاشرت، اخلاق، اور روحانیت سب کچھ داخل ہو۔ بالفاظِ دیگر، ہماری تحریک کو صرف سیاسی نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اسے روحانی اور اعلیٰ فلسفۂ زندگی کے تحت ہونا چاہیئے تاکہ اس جد وجہد سے نہ صرف ہماری سیاسی زندگی متاثر ہو بلکہ ہماری زندگی کا ہر شعبہ اس سے اثر پذیر ہو۔ اور ہماری زندگی کا ایک نیا باب شروع ہو جسے ہم تاریخ کا نیا دور کہہ سکیں۔ زندگی کا یہی وہ نیا باب اور نیا دور ہے جسے گاندھی جی کانگریس کے ذریعے ہندوستان میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اور یہ گاندھی جی کیا تھے؟ اسے خود انہی کے الفاظ میں سن لیجیے۔ انہوں نے اپنے متعلق فرمایا تھا کہ

> میں اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتا ہوں۔ چونکہ میں ویدوں۔ اپنشدوں۔ پرانوں، اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں کو مانتا ہوں۔ اوتاروں کا قائل ہوں۔ اور تناسخ پر عقیدہ رکھتا ہوں۔ میں گئو رکھشا کو اپنے دھرم کا جزو سمجھتا ہوں اور بت پرستی سے انکار نہیں کرتا۔ میرے جسم کا رواں رواں ہندو ہے۔

اور اسی گاندھی کے متعلق (مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے اپنے خطبہ کانگریس (رپرتاپ گڑھ) میں کہا تھا کہ

> وقت کی ساری پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں انسانی فطرت کا ایک ہی روشن پہلو ہے جو مہاتما گاندھی کی روح عظیم کو تھکنے نہیں دیتا۔

بہرحال، یہ ہے وہ بنیاد جس پر "انڈین نیشن" کی عمارت استوار ہوئی ہے۔ اب آپ سوچ لیجئے کہ ہندی مسلمان اس نیشن کا فرد کیسے قرار پا سکتا ہے؟ جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا ہے یہ ہندو کی منافقت ہے جس کی رُو سے وہ ہندوستان کے تمام باشندوں (ہندوؤں اور غیر ہندوؤں) کو "ہندی قوم" کے افراد کہتے ہیں اور اپنی (خالصتہً ہندوانہ) حکومت کو سیکولر قرار دیتے ہیں۔ اس سے ان کے، غیر ہندوؤں پر حکومت کرنے کے جذبہ کی تسکین ہوتی ہے۔ ورنہ منتہیٰ ان کا یہی ہے کہ ہندوستان میں کوئی غیر ہندو رہنے نہ پائے۔ یا وہ ہندومت اختیار کر لیں اور یا انہیں اتنا تنگ کیا جائے کہ وہ ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں۔ وہ 'ہندو' جو خود اپنے اندر مختلف درنوں کا اس طرح قائل ہے کہ شودر کی جرأت نہیں کہ وہ اس سڑک پر قدم رکھ سکے جس پر برہمن جا رہا ہو اور وہ چاول کھا سکے جو اونچی ذات کے ہندوؤں کے لئے مختص ہوں وہ کسی غیر ہندو کو اپنا ہم قوم کس طرح کر سکتا ہے؟

۳۔ مسلم قومیت

یہ تھی ہندو کی سازش جس کے خلاف قائد اعظم نے علم جہاد بلند کیا اور کہا کہ مسلمان اپنے دین کی بنیاد وں پر ایک الگ مستقل قوم ہیں۔ وہ 'وطن کے اشتراک کی بنا پر ہندو قوم کا جزو نہیں بن سکتے۔

اس تحریک کی مخالفت ہندوؤں نے تو کرنی ہی تھی لیکن مقام حیرت ہے کہ خود مسلمانوں کے ایک حلقہ کی طرف سے بھی اس کی مخالفت ہوئی اور سخت مخالفت۔ اس مخالفت میں نیشنلسٹ علماء اور جماعت اسلامی پیش پیش تھے۔ نیشنلسٹ علماء تو دو قومی نظریہ ہی کے خلاف تھے۔ جماعت اسلامی کے امیر کا کہنا یہ تھا کہ قائد اعظمؒ کی طرف سے پیش کردہ دعوئے قومیت محض مغرب کی نقالی ہے۔ یہ وہی نیشنلزم ہے جس کی مدعی یورپ کی قومیں ہیں اسے اسلام سے کچھ واسطہ نہیں۔ آپ ان کی کتاب "سیاسی کشمکش حصہ سوم" دیکھئے۔ شروع سے اخیر تک یہی پکار سنائی دے گی۔ کہیں لکھا ملے گا۔

> (وہ) اگر وہ زیادہ تر اس طبقہ پر مشتمل ہے جس نے تمام تر مغربی طرز پر ذہنی تربیت پائی ہے۔ یہ لوگ سیاسی فکر تو مغربی ماخذ سے لیتے ہیں مگر چونکہ موروثی طور پر اسلام کے حق میں ایک تعصب ان کے اندر موجود ہے اور "مسلمان قوم" ہونے کا شعور ان کے اندر پیدا ہو گیا ہے اس لئے جو کچھ یہ کرنا چاہتے ہیں "مسلمان قوم" کے لئے اسلام کے نام ہی سے کرنا چاہتے ہیں۔ (صفحہ ۲۵)

کہیں مطالبہ پاکستان کے سلسلہ میں کہا کہ

> یہ مسلمانوں کی قوم "میں پیدا ہوئے ہیں اس لئے "مسلمانوں کی حکومت" ان کا نصب العین بن گیا ہے..... ان کے منہ نے یہ بھی جائز ہے کہ جس طرح دوسری قوموں میں قوم پرستی (نیشنلزم) پیدا ہوتی

ہے اسی طرح ان میں بھی ہو۔ (صفحہ ۴۴۸)

اس کے بعد اس تحریک کے مدعیوں کو ڈانٹ کر کہا کہ

> اگر یہ آپ کی قومیت اور آپ کا کلچر ہے اور یہ آپ کے قومی مقاصد ہیں تو آپ اپنی قوم کا نام جو چاہیں تجویز فرمالیں، اسلام کا نام استعمال کرنے کا آپ کو حق نہیں کیونکہ اسلام آپ کی اس قومیت اور اس کلچر سے تبرّی کرتا ہے...... اس نام کو بدل دینے کی ضرورت اس لئے ہے کہ آپ کے یہ نظریات جن پر آپ اپنی قومیت کی بنا رکھ رہے ہیں اصولاً اسلام کے خلاف ہیں۔ (صفحہ ۴۴۹)

آپ کو معلوم ہے کہ وہ نظریات کیا تھے جن پر تحریکِ پاکستان کے بانی اپنے دعوائے قومیت کی بنیاد رکھ رہے تھے اور جن کے متعلق مودودی صاحب کا ارشاد تھا کہ وہ اصولاً اسلام کے خلاف ہیں! آپ غور سے سنئے۔ لیکن کس سے؟ خود مودودی صاحب کی جماعت کے ترجمان 'ایشیا' سے جس نے اپنی ۲۵ اپریل ۱۹۸۱ء کی اشاعت کے اداریہ میں لکھا ہے:

> ۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو علی گڑھ یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے یہ بیان فرمایا کہ ہم کہیں ہندو قوم کے ساتھ مل کر ایک قومیت اختیار نہیں کر سکتے۔
>
> مسلمانوں کی بنیاد کلمہ توحید ہے۔ وطن نہیں۔ نہ ہی نسل۔ ہندوستان کا پہلا فرد جب مسلمان ہوا تھا تو وہ اپنی سابقہ قوم کا فرد نہیں رہا۔ ایک جداگانہ قوم کا فرد بن گیا۔"

پھر مودودی صاحب کے اپنے رسالہ ترجمان القرآن کی اشاعت بابت اپریل ۱۹۸۱ء کے اشارات میں بتایا گیا ہے کہ یورپ میں وطنیت کو قومیت کا مدار قرار دیا گیا اور یہ وبا مسلم ممالک میں بھی عام ہوگئی۔ لیکن

> جو دو تین ممالک وطن پرستی کے اس حملے سے محفوظ رہے ان میں سرفہرست پاکستان ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے یہ ملک، وطن پرستی کے خلاف مسلسل جہاد اور اس دینِ باطل پہ دینِ حق کے تسلط اور غلبے کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آیا ہے تو یہ زیادہ صحیح ہوگا۔

اس کے متعلق ہم اس سے زیادہ اور کیا کہیں کہ اے کاش! ان حضرات کو اس اعترافِ صداقت اور اعلانِ حقیقت کی توفیق، تحریکِ پاکستان کے دوران نصیب ہو جاتی!

بہرحال، یہ ہے مختصر الفاظ میں ہندوؤں کی تحریکِ نیشنلزم اور اسلامی قومیت کی تحریک کا پس منظر۔

۴- اختلافات کیسے رفع ہوں؟

مودودی صاحب نے کہا تھا کہ کتاب و سنت کی رُو سے کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جس پر مسلمانوں کے تمام فرقے متفق ہو سکیں۔ اس کا حل یہ ہے کہ چونکہ یہاں کی آبادی کی اکثریت حنفی ہے اس لئے پاکستان میں فقہ حنفی نافذ کر دی جائے۔ باقی فرقے تو اس سے بھی متفق نہیں ہوں گے لیکن کم از کم ملک کی اکثریت (حنفیوں) کے لئے ایک متفق علیہ ضابطہ قوانین رائج ہو جائے گا۔

آیئے ہم دیکھیں کہ خود حنفیوں کا اس باب میں کیا حال ہے؟ کراچی سے ایک ماہنامہ شائع ہوتا ہے۔ البلاغ۔ حنفی فقہ کے مفتی، مولانا محمد شفیع صاحب اس کے سرپرست ہیں، اور ان کے صاحبزادہ، محمد تقی عثمانی اس کے مدیر۔ اس رسالہ کی مئی سنہ ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں ایک صاحب کا ایک سوال شائع ہوا ہے، اور تین حنفی مفتی حضرات کی طرف سے اس کا جواب۔ پہلے سوال ملاحظہ فرمایئے۔

> کیا فرماتے ہیں علماء دین اندریں مسئلہ کہ مسمی زید ناحق طور پر قتل کے کیس میں ماخوذ ہو گیا جس میں چار واقعی قاتل تھے مسمی زید ناحق تھا۔ کیس کے دوران ملزموں کے ورثاء مقتول کے وارثوں کے ساتھ صلح تجویز کرتے رہے کیونکہ شہادتیں مضبوط تھیں اور سزا کا خطرہ غالب تھا۔ بالآخر طے یہ ہوا کہ قاتلین کے ورثاء تین لڑکیوں کے رشتے اور چار ہزار روپیہ دیں، اور مقتول کے ورثہ سیشن کی عدالت میں اپنے گواہان بٹھا دیں گے چنانچہ روپیہ امانت رکھ دیا گیا اور تین شیر خوار لڑکیوں کے عقد کر دیئے گئے۔ مسمی زید کی لڑکی کا عقد ایک پینتیس سالہ آدمی سے جو کہ مقتول کا بھائی اور لوفر مزاج آدمی تھا زید کی اجازت سے کر دیا گیا۔
>
> بعد میں مقتول کے ورثاء نے سیشن میں پوری ڈٹ کر گواہی دی جس میں پانچوں ملزموں کو حکم سزائے موت سنایا گیا ہے۔ چار ہزار روپے تو ثالث نے مقتول کے ورثاء کو دینے سے انکار کر دیا کہ تم نے دھوکہ کیا ہے لہٰذا تم اس کے حقدار نہیں، مگر عقد تو پہلے ہو چکے تھے۔ اب اس پندرہ سال کے بعد زید کی لڑکی جوان ہوئی تو اس نے اپنے عقد کی تنسیخ کا اعلان کر دیا۔ اور شہادتیں فراہم کیں۔ اب شرعی طور پر التماس ہے کہ کیا باپ جبکہ موت و حیات کی کشمکش میں پھنسا ہوا تھا۔ اور اس نے مقتول کے گھرانے میں اپنی اس شیر خوردہ کا عقد کر دیا تھا۔ پھر ایک لوفر طبع اور عمر میں اتنے تضاد کے باوجود محض اپنے آپ کو بری کرانے کی خاطر جبکہ اس ہندہ مظلومہ کو وہاں ذلت و خواری نصیب ہوگی شرعاً عقد درست ہے یا نہیں ہے بصورت ثانی ہندہ کسی دوسری جگہ عقد کر کے شریفانہ زندگی گذارنے کی مجاز ہے یا نہیں؟ کیا ابتدا ہی سے باپ سیئی الاختیار نہیں ہے جس میں ساۃ کو حق مل سکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

اس کے جواب میں مدرسہ خیر المدارس، ملتان کے نائب مفتی، محمد اسحاق صاحب، کہتے ہیں کہ

> صورت مسئولہ میں بہ تقدیر صحت واقعہ یہ نکاح منعقد ہی نہیں ہوا تھا۔ لڑکی مذکورہ آزاد ہے۔ جہاں چاہے اپنی مرضی کے مطابق دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے۔

جامعہ اشرفیہ مسلم ٹاؤن۔ لاہور۔ کے مفتی جمیل احمد تھانوی صاحب فرماتے ہیں کہ

> نکاح بالکل درست ہے۔ یہ فسخ نہیں ہو سکتا۔ اب جس طرح ہو سکے زور سے۔ لالچ سے۔ جبر سے طلاق مل جائے[1] تو علیحدگی ہو سکتی ہے۔

اور تیسرا جواب مفتی محمد شفیع صاحب کا ہے جو غیر منقسم ہندوستان میں، دیوبند کے مفتی تھے، اور اب پاکستان میں بھی "مفتی صاحب" ہی کہلاتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ نکاح درست تھا۔ اب ....

---

[1] غور فرمایا آپ نے طلاق لینے کا طریقہ۔ زور سے، لالچ سے، جبر سے"

لڑکی کو بوقت بلوغ خیار فسخ حاصل ہوگا - وہ شرعی قاضی یا مسلمان حاکم مجاز کی عدالت میں دعوےٰ کرے - شرائط شرعیہ کے مطابق ثبوت پیش کرکے وہ اپنا نکاح مسلمان حاکم سے فسخ کرا سکتی ہے - خود بخود نکاح باطل نہیں ہوگا۔

یعنی ایک مفتی صاحب کے نزدیک سرے سے یہ نکاح ہی نہیں ہوا تھا - عورت آزاد ہے - جہاں جی چاہے نکاح کرے۔ دوسرے صاحب کے نزدیک نکاح بالکل درست ہوا تھا۔ اب یہ فسخ نہیں ہوسکتا - اور تیسرے صاحب بین بین چلتے ہیں کہ نکاح تو درست تھا لیکن اب لڑکی عدالت کی طرف رجوع کرکے اسے فسخ کرا سکتی ہے -

اور یہ تینوں مفتی صاحبان حنفی دیوبندی ہیں -

جب تک احکام شریعت کا مدار انفرادی فتاویٰ پر رہے گا، اس قسم کے اختلافات ناگزیر ہوں گے - ان اختلافات کے مٹانے کا ایک ہی طریق ہے کہ ان امور کا فیصلہ اسلامی حکومت کی طرف سے ہو - یہی قرآن کریم کی ہدایت ہے اور یہی سنت رسول اللہؐ کا متعین فرمودہ مسلک -

---

۵- ہمارا اسلام!

روزنامہ مشرق لاہور میں شائع شدہ ایک خبر۔

شیخ علی ہجویریؒ (یعنی داتا گنج بخشؒ) کے مزار کو غسل دینے کی تقریب نہایت عقیدت و احترام کے ساتھ منائی گئی۔ اس مقدس تقریب پر دربار کی امور مذہبی کی کمیٹی کے ارکان کے علاوہ ہزاروں عقیدتمندوں نے شرکت کی۔ غسل کا پانی حاصل کرنے کے لئے ہزاروں افراد بوتلیں لے کر آئے تھے اور بعض لوگ اس متبرک پانی کی چند بوندیں حاصل کرنے کے لئے صبح سے داتا کے حضور میں کھڑے تھے تقریب کا افتتاح تلاوت قرآن سے ہوا - اس کے بعد ارکان کمیٹی نے تعویذ قبر سے غلاف اتارے اور چادر عرق گلاب اور روح کیوڑہ سے تعویذ کو غسل دیا گیا - جب عرق گلاب کا پہلا قطرہ تعویذ پر گرا تو ہزاروں افراد نے باآواز بلند کلمہ طیبہ کا ورد شروع کر دیا۔ (بحوالہ پیغام صلح - ۱۴ اپریل)

۲- روزنامہ مشرق ہی کا ایک اور اقتباس:

حضرت بابا صاحب (بابا فرید الدین گنج شکرؒ) بارہ برس تک صائم رہے - اس عرصہ میں نہ کچھ کھایا نہ پیا گلے میں ایک کاٹھ کی روٹی ڈال رکھی تھی - جب بھوک غلبہ کرتی تو آپ روٹی پر دانت مارتے بارہ سال کی ریاضت کے بعد جب والدہ کے پاس پہنچے تو انہوں نے لکڑی کے سہارے کو بھی برا منایا اور کہا کہ ابھی تم پر نفس غالب ہے - جاؤ اور بغیر چوبی روٹی کے صائم رہو - چنانچہ انہوں نے کاٹھ کی روٹی پھینک دی اور پھر بارہ سال تک صائم رہے۔ (مشرق - لاہور ۳ مارچ)

اور روزنامہ جاوداں - لاہور سے یہ اقتباس

آپ نے بہت سخت سے سخت مجاہدے کئے، چلہ معکوس بھی کاٹا - یعنی بارہ سال کنوئیں میں لٹک کر نماز

معکوس ادا کی (اس کا طریقہ یہ ہے کہ چلّہ کرنے والا رات کو پاؤں میں رسی باندھ کر کنوئیں میں اُلٹا لٹک جاتا ہے اور عبادت میں مصروف رہتا ہے — ناقل) جواہر فریدی میں لکھا ہے کہ اس زمانہ میں حال ریاضت اور استغراق درجۂ فنا میں یہاں تک پہنچے کہ چڑیوں اور جانوروں نے آپ کے پاؤں اور وجود مبارک میں گھونسلے بنا لئے تھے "

(روزنامہ جاوداں - لاہور ۴ر فروری)

۳- روزنامہ جاوداں، بابت ۱۴ر اپریل، میں شائع شدہ ایک خبر

سیالکوٹ، ۱۲ر اپریل - باور کیجئے کہ سالانہ عرس پیر سید مراد علی شاہ (شہید اوّلؒ) کے سلسلہ میں گذشتہ شب جو محفل سماع منعقد ہوئی - اس میں جنوں کے ایک گروہ نے بھی شرکت کی اور اپنی شرکت کا ثبوت بھی دے دیا - ریڈیو پاکستان کے مشہور قوال حافظ عطا محمد قوالی کر رہے تھے - اس کی صدارت گورنمنٹ کالج آف کامرس کے پرنسپل احسان قریشی صابری کر رہے تھے کہ دفعتاً ایک جھکڑ آیا اور روشنی گل ہو گئی اس پر حافظ عطا محمد قوال نے تلاوت قرآن پاک شروع کر دی - روشنی واپس آ گئی - بزم سماع پھر سے شروع ہوئی حاضرین میں سے ایک شخص نذیر احمد نامی پر ایسا حال وارد ہوا کہ بایدو شاید - نذیر احمد نے عربی زبان میں گفتگو شروع کر دی (حالانکہ نذیر احمد عربی نہیں جانتا) اس سے مجلس میں موجود صوفیائے کرام نے اندازہ لگایا کہ جن اسی شخص پر وارد ہے - تمام مجلس یک دم معطر ہو گئی اور ایسی لطیف خوشبو ہر ایک نے محسوس کی کہ اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی -

(جاوداں - ۱۴ر اپریل -)

۴- جنوں کی بات چلی ہے تو اس ضمن میں ایک اور واقعہ بھی ملاحظہ فرماتے جائیے - واقعہ ہے مولانا اشرف علی تھانویؒ کا - راوی ہیں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب - اور درج ہوا ہے رسالہ البلاغ کی مئی ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں -

تھانہ بھون میں ایک جن تھا جس کا نام تھا شہادت خاں - بہت لوگوں کو تکلیف دیتا پھرتا تھا - حضرتؒ نے اس کے نام پرچہ لکھ دیا جس میں اس کو خدا کے عذاب سے ڈرایا - یہ پرچہ دیکھ کر کہنے لگا کہ یہ کوئی تعویذ تو ہے نہیں جس سے جن بھاگ جاتے - مگر ایسے شخص کا خط نہیں ہے جس کی پرواہ نہ کی جائے - اچھا اب ہم جاتے ہیں - آگے کسی کو تکلیف نہیں پہنچائیں گے -

۵- روزنامہ جاوداں (راولپنڈی) کی ۱۲ر اپریل کی اشاعت میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ آزاد حکومت، مظفر آباد نے سرکاری دفاتر اور ملازمین کی کارکردگی اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے انقلابی اقدامات کئے ہیں اور ملازمین سے کہا گیا ہے کہ وہ ان اقدامات کی سختی سے پابندی کریں - ان اسلامی، انقلابی اقدامات میں ایک یہ بھی ہے کہ -

گزیٹڈ افسروں کے لئے سیاہ جناح کیپ کسی بھی رنگ کی قمیص - سفید شلوار یا پاجامہ - کالی اچکن اور کالے جوتے قومی لباس مقرر کیا گیا ہے - یہ لباس سرکاری تقاریب کے لئے مقرر کیا گیا ہے - عام طور پر گزیٹڈ افسر کسی بھی رنگ کی اچکن پہن سکتے ہیں -

گذشتہ سے پیوستہ

ہندو مذہب کیا ہے؟

(۲)

(اس مضمون کی پہلی قسط ماہ جون میں شائع ہو چکی ہے)

وید الہامی کتاب نہیں

انہی اشکال کی بنا پر ہندوؤں کے بڑے بڑے ودوان (علماء) اس اعتراف پر مجبور ہو گئے کہ وید الہامی نہیں ہیں۔ چنانچہ ویدوں کے عالم اور براہمن گرنتھوں کے مترجم پنڈت ستیہ ورت سام سشری اپنی کتاب ترئی پرلچے (صفحہ ۲) پر تسلیم کرتے ہیں کہ:-

ایسے ہی بلا شک وشبہ یہ بات صحیح ہے کہ ہمارے بزرگ رشیوں ہی نے ویدوں کو تصنیف کیا تھا۔

اسی طرح پنڈت نروید شاستری (جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے) اپنی کتاب رگوید آلوچن کی بھومکا (تمہید) میں مسٹر تلک کے متعلق لکھتے ہیں کہ:-

تلک بھی برہم وادی پکش (ویدوں کے الہامی ہونے کے عقیدہ) کا کھنڈن (تردید) کرتے ہیں

یہی پنڈت جی اپنے گرو پنڈت سام شری کے متعلق لکھتے ہیں:-

سام شری پکش ورتمان (موجودہ) ویدوں کو بھارتیوں (ہندوستانیوں) کے لئے ہی مانتے ہیں۔ ویدوں کو ایشوری گیان (علم خداوندی) نہیں ملنتے۔ ان کو آریہ ودنائی آریوں کی سبھیتا (تہذیب) کا اتہاس (تاریخ) مانتے ہیں۔

پنڈت جواہرلال نہرو اپنی کتاب (THE DISCOVERY OF INDIA) میں لکھتے ہیں:-

بہت سے ہندو ویدوں کو الہامی کتاب سمجھتے ہیں۔ یہ میرے نزدیک ہماری بڑی بدقسمتی ہے کیونکہ اس طرح ان کی حقیقت ہم سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ وید صرف اُس زمانہ کی معلومات کا مجموعہ ہیں۔ وہ بہت سی چیزوں کا غیر مرتب شدہ ذخیرہ ہیں۔ دعائیں، قربانی کی رسومات، جادو، نیچرل شاعری وغیرہ۔

(صفحہ ۷۵)

حقیقت بھی یہی ہے کہ وید دراصل آریوں کی قدیم زندگی کی معاشرت کی تاریخ ہیں۔ چنانچہ پنڈت کرشن کمار بھٹاچارج سابق پروفیسر سنسکرت پریذیڈنسی کالج کلکتہ لکھتے ہیں:-

رگوید ایک کتاب ہے جو ایک ایسی قوم کی حالت بیان کرتی ہے جو بلاشبہ حالتِ خانہ بدوشی سے بہت ترقی کرچکی تھی۔ اس میں شہروں کا، دیہات کا، اور بادشاہوں، قمار خانوں اور کسبیوں کی کئی ایک دوسری علامات کا ذکر ہے جو کہ حالتِ خانہ بدوشی میں نہیں پائی جاتیں۔ رگوید کے دوسرے حصے ان کے شاعروں یا رشیوں نے اس ملک میں تصنیف کئے۔ رگوید مختلف ملکوں میں لکھا گیا جن میں ایک دوسرے سے بہت عرصہ کا فرق ہے۔ ہمارے بزرگوں نے جو خانہ بدوشی کی زندگی بسر کی ہے، اس کی نسبت علم ہنود (سنسکرت) کی نہایت ہی قدیم کتابوں میں اس قدر کم اشارات ملتے ہیں کہ فقط رگوید کے مطالعہ سے ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ایسا ہی ہوگا۔ کیونکہ گایوں کی بازیافت، گایوں کی لوٹ، گایوں کی ترقی تعداد اور گایوں کی بخششیں اس کتاب کے مضامین ہیں اور کئی اور طریقوں سے اس بات پر زور دیا گیا ہے جس سے ایک بے تعصب پڑھنے والے کو بھی یہی نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ یہ بیانات حالتِ خانہ بدوشی کا ذکر کر رہے ہیں جو یا تو فی الحقیقت اس وقت موجود تھی، یا جس کو گزرے ہوئے بہت عرصہ ہو چکا تھا۔ اُن اُصولوں کی نسبت جو اس زمانہ میں مروج تھے رگوید ذرا بھی ہماری دستگیری نہیں کرتا۔ اس بارہ میں ان ایک ہزار بھجن کی مثال ایک لق و دق اور ہولناک بیابان کی سی ہے جس میں جدھر نگاہ کرو ببول کے کانٹوں اور خار دار جھاڑیوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آئے۔ پرمیشر کی اس اناد ی گیان (علم ازلی یعنی رگوید) کی چند ایسی سوکتیں ہیں جن کا خطاب گھی، گائے اور کھیت ین کیطرت ہے اور جن میں ایک ہارے ہوئے قمار باز کی ناامیدی کا ذکر ہے۔ دوسری سوکتوں میں ہم بیشمار جادو اور منتر پاتے ہیں جو بیماری کے دفعیہ، عشق، لڑائی یا قمار بازی میں پوری کامیابی حاصل کرنے کے لئے یا تو ایک آدمی کو خود یا اس کے لئے کسی جادوگر کو پڑھنے چاہئیں ..... اتھروید میں چھوٹی چھوٹی جیتوں مثلاً پسوؤں، جوؤں وغیرہ کے دفعیہ کے لئے اور ایک گنجے سر پر بال پیدا کرنے کے لئے معقول ہدایات لکھی ہیں، اور بے معنی ہدایات بھی لکھی ہیں مثلاً جار و گوا کمبل کے سلیپر (ڈھیلی جوتی) پہنے ہوئے مردار سے پر کھڑا ہے اور اسے یں دے رہا ہے۔ جناب، مہربانی کر کے بتلایئے کہ نئے چاند کے روزمرہ ملاقات کرنے سے کیا فائدہ؟ وغیرہ۔

(ویدوں کی قدامت۔ از مولانا اکبر شاہ خان مرحوم)

حتیٰ کہ ویدوں کی زبان کے متعلق بھی تحقیق ہے کہ وہ نقائص سے خالی نہیں۔ چنانچہ گوروکل کا پروفیسر وید پنڈت چندرمنی ودیا النکار، اپنے ترجمہ نرکت حصہ اول میں صفحہ ۹۰ پر لکھتے ہیں،

پرماتما پورن (مکمل) ہے۔ یدی (اگر) وید پرماتما کے دیئے ہوئے ہیں تو اس کی بھاشا (زبان) میں اس اپورنتا (نقص یا ادھورے پن) کا بھاؤ دوش (عظیم الشان غلطی) نہیں ہونی چاہیئے ..... یہ آشنکا (اعتراض) ہمیں بہت کھٹکتا ہے۔ ویدک بھاشا میں اتنی بھاری ترٹی (کمزوری، خرابی) کا ہونا بڑا کھٹکتا ہے۔

ویدوں کی تعلیم

اب ہم اس مرحلے کے نازک ترین حصہ پر پہنچ رہے ہیں۔ یعنی سوال یہ ہے کہ ویدوں کی تصنیف و تدوین کی تاریخ اور ان کے مصنفین سے قطع نظر دیکھنا یہ ہے کہ وید جس حالت میں بھی آج

دنیا کے سامنے ہیں' ان کی تعلیم کیا ہے؟ یعنی اب اسناد کو چھوڑ کر متن (TEXT) کی طرف آنا چاہیئے۔ اور دیکھنا چاہیئے کہ اس سے ہم کس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ ہم نے جس وقت سے عنوان زیر نظر لکھنے کے لئے قلم اٹھایا (بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس سے بھی قبل' جب یہ مضمون "ہنوز اندر طبیعت می خلد" کے دور میں تھا) ہم اس کشمکش میں غلطاں و پیچاں ہیں کہ ویدوں کی تعلیم کو سامنے لانے کے لئے ان کے اقتباسات دے دیئے جائیں یا نہ۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ اس میں آخر کشمکش واضطراب کی کون سی بات ہے۔ لیکن یہ خیال آپ کے دل میں اس لئے آرہا ہے کہ آپ نے ویدوں کو پڑھا نہیں (حقیقت یہ ہے کہ خود ہندوؤں میں سے بھی سوائے ان کے بڑے بڑے وِدوان ہندوؤں کے شاید ہی کسی نے ویدوں کا مطالعہ کیا ہو) ویدوں میں ایسی ایسی باتیں ہیں کہ انہیں سامنے لانے کا خیال کیا جائے تو شرم وحیا اس طرح دامنگیر ہو جاتی ہے کہ آگے قدم بڑھانے کی ہمت ہی نہیں پڑ سکتی۔ ہمیں اس امر کا احساس ہے کہ ویدوں کی صحیح تعلیم کا اندازہ نہیں ہو سکتا جب تک ان کے اقتباسات سامنے نہ آجائیں۔ لیکن ہم قارئین کے ذوقِ سلیم کی لطافت کو اس ضرورت پر قربان کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ اس لئے مجبوراً فیصلہ یہی کیا گیا ہے کہ اس قسم کے اقتباسات کو چھوڑ کر محض اشارات پر اکتفا کیا جائے۔ ذرا غور کیجئے۔ پرنسپل گرفتھ نے ویدوں کا ترجمہ کیا ہے۔ اوّل تو مترجم کی حیثیت سے ان کا فرض تھا کہ جو کچھ بھی ان کے سامنے آئے اس کا ترجمہ کرتے جائیں۔ پھر اہلِ مغرب کا انداز ایسا ہے کہ جن باتوں کو ہم لوگ بڑی جھجک اور تامل سے کہتے ہوئے بھی ہچکچاتے ہیں' وہ نہایت آزادی اور بے باکی سے کہہ جاتے ہیں۔

مشکل اندر مشکل

اس کے باوجود ویدوں میں ایسے مقامات آجاتے ہیں جہاں گرفتھ صاحب کو بھی کہنا پڑتا ہے کہ مجھ میں ان کا ترجمہ سامنے لانے کی ہمت نہیں پڑتی۔ مثلاً یجر وید ادھیائے ۲۳ منتر ۲۰ تا ۲۸ پر پہنچ کر جہاں یجمان کی بیوی کا گھوڑے سے...... کی کیفیات درج ہیں' گرفتھ صاحب قلم رکھ کر بیٹھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں تو فقط اتنا کہ

THIS AND THE FOLLOWING NINE STANZ AS
ARE NOT REPRODUCIBLE EVEN IN THE SEMI-
-OBSCURITY OF A LEARNED EUROPEAN LANGUAGE

یہ اور اگلے نو منتر اس قابل نہیں کہ انہیں یورپ کی کسی علمی زبان میں دھندلی سی شکل میں بھی پیش کیا جا سکے۔

یہ تو تھا ایک انگریز مترجم۔ اب خود ہندوؤں کی زبان سے اس حقیقت کا اعتراف سنیئے۔ نکاح ایک مقدس رسم ہے۔ جس سے انسان کی زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ اس رسم میں انسان کو اس کی نئی زندگی کی ذمہ داریوں حقوق و فرائض اور میاں بیوی کے تعلقات وروابط کی یاد دلائی جاتی ہے۔ خطبات نکاح اور ایجاب و قبول ان ہی مقاصد کے لئے ہوتے ہیں۔ دنیا کی ہر قوم اور ہر مذہب میں اس مقدس پیمان کی توثیق کے لئے کچھ نہ کچھ کہلوایا جاتا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں اس تقریب پر وید کے اشلوک پڑھے جاتے ہیں۔ وہ اشلوک کیا ہیں؟ ان کا ترجمہ تو ہم (اس وقت کے ماحول جس کا تذکرہ کیا جا چکا ہے) پیش نہیں کر سکتے' لیکن ان کے متعلق خود ہندوؤں کے سمجھدار طبقہ کی آراء پیش کر سکتے ہیں۔ پنڈت گنگا پرشاد اپادھیائے (ایم۔ اے) پردھان آریہ سماج الٰہ آباد۔ اخبار آریہ مترا بابت ۶ر جون ۱۹۲۹ء میں

اس موضوع پر اپنے مضمون میں لکھتے ہیں۔

(رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۸۵، منتر ۳۰) منتر اتنا اشلیل (گندہ) ہے کہ سادھارن (معمولی) سنسکرت جاننے والا ور (دولہا) بھی اسے پڑھنے کا ساہس (حوصلہ) نہ کریگا۔ ابھی تو لوگ اس لئے پڑھ دیتے ہیں کہ نہ پڑھنے والا سمجھتا ہے نہ سننے والے۔ پرنتو (مگر) کیا آریہ سماج سروا (ہمیشہ) یہی اوستھا (حالت) رکھنی چاہتا ہے؟ یدی (اگر) اس منتر کو نہ نکالا گیا تو اس کے ورودھ (خلاف) یا تو بھیانک ودروہ (خوفناک مخالفت) ہوگی یا لوگ اسے اپیکشا کی درشٹی سے (بنظر حقارت) دیکھ کر چھوڑ دیا کریں گے۔ دونوں ہی باتیں انشٹ (بُری) ہیں۔

آریہ سماج مین پوری کے پردھان بابو شیام سندر لال جی نے بھی اپنے مضمون مطبوعہ اخبار آریہ متر آگرہ بابت ۵ ستمبر ۱۹۲۹ء میں اس کی تائید کی ہے۔ چنانچہ سوامی سوتنترانند جی مہاراج نے اس منتر (نیز اسی قسم کے دوسرے منتروں) کو اسی بناء پر سوامی دیانند جی کی تصنیف سنسکار ودھی سے نکال کر سوامی جی کے نام سے ایک نئی سنسکار ودھی شائع کر دی ہے۔ (بحوالہ ویدارتھ پرکاش ص۱۱)

ان تصریحات سے آپ ہماری ان مشکلات کا اندازہ کر سکتے ہیں جن کی طرف شروع میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ہم ایک مرتبہ اس حقیقت کو پھر واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ان چیزوں کے تذکرہ سے ہمارا مقصود کسی کی دل آزاری قطعاً نہیں۔ مقصود فقط یہ بتانا ہے کہ ویدوں کے اندر (جس شکل میں وہ آج ہمارے سامنے موجود ہیں) ایسی ایسی باتیں لکھی ہیں جنہیں اب تو اور خود ہندو صاحبان بھی اس قابل نہیں سمجھتے کہ انہیں ویدوں میں رکھا جائے۔ اس سے آپ اندازہ فرما سکتے ہیں کہ انہیں غیر محرف آسمانی کتابیں کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے (اور جیسا کہ خود ہندو صاحبان کو بھی تسلیم ہے) وید قدیم آریہ قوم کی ابتدائی قبائلی زندگی کی معاشرت کی تاریخ ہیں۔ اس لئے ان میں تعلیم بھی اسی قسم کی ہے جیسی ابتدائی قبائل یا اقوام کی زندگی ہوتی ہے۔ چنانچہ ویدوں میں کہیں اس امر پر استعجاب ہے کہ سرخ رنگ کی گائے کس طرح سفید رنگ کا دودھ دیتی ہے "کبھی اس پر کہ تمام دریا سمندر میں جا گرتے ہیں لیکن سمندر پھر بھی نہیں بھرتا"۔ اس زمانہ میں قربانیاں مذہب کی اصل و بنیاد ہوتی تھیں۔ اس لئے ویدوں میں اکثر و بیشتر قربانی اور اس کے لوازمات سے متعلق گیت، منتر اور احکام ملتے ہیں۔ قربانی کے وقت ہوتر برہمن رگوید کے منتر پڑھتا تھا۔ ادھوریو (ADHVARYU) یجروید کے منتر پڑھتا۔ اور ادگاتا برہمن سام وید کے۔ بعد میں ان پروہتوں میں ایک اور کا اضافہ ہوا جسے برہما کہا جاتا تھا۔ وہ گویا ان کا صدر تھا وہ اس امر کی نگرانی کرتا تھا کہ قربانی اتھروید کے اصول و احکام کے مطابق ادا ہوتی ہے یا نہیں۔ قربانیوں میں سوم رس کا استعمال عام ہوتا اور اسے مقدس سمجھا جاتا۔ (ان امور کی تصریحات کے لئے دیکھئے اس گیتا کی معرکۃ الآراء کتاب)

قدیم آریوں کا معاشرتی نقشہ

ابتدائی خانہ بدوشی کی زندگی کے بعد ان آریوں نے زراعت کی زندگی اختیار کی۔ چنانچہ اس زمانہ میں ویدوں کے جو منتر تصنیف ہوئے ان میں ان کی اسی زندگی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً یجروید ادھیا ۱۱ منتر ۸۳ میں لکھا ہے۔

اے انسان! جس طرح طاقتور گائے نباتات کھا کر بچھڑے اور انسانوں کے لئے عمدہ دودھ دیتی ہے اسی طرح تو بھی پھل پھولوں کے رس کا استعمال کر کے اپنے جسم اور آتما کی طاقت کو حاصل کر۔

اسی ادھیا کا اکھتر واں منتر یہ ہے:۔

اے کسانو! تم اناج وغیرہ بونے کے لئے زمین کو پھاڑنے والا جو پھال ہے اور اس پھال کو مضبوط کرنے کے لئے اس کے پیچھے جو لکڑی کی خوبصورت ہتی لگی ہوئی ہے تم اس سے اناج پیدا کرنے والی زمین کو پھاڑو اسی طرح تم اپنے خوبصورت رتھوں کو چلاؤ اور ان کی حفاظت کرو۔

اس سے پہلے چار منتروں میں لکھا ہے:۔

روشن عقل اور روشن ضمیر انسان ہل کو جوتنے میں لگا کر کھیتی کا کام کرتے اور تمام دوالوں کے سکھ کو بڑھاتے ہیں۔ اے انسانو! تم بیلوں کو جوتنے میں لگا کر کھیتی کی خاطر زمین کو اچھی طرح جوتو، اور اس کو اچھی طرح سے جوت کر اس میں جو وغیرہ اناج بوؤ۔۔۔۔۔ جو محنت کرنے والا کاشتکار ہے اس کو چاہیئے کہ بیلوں کے ذریعے ہل پھال لگا کر زمین کو جوتے۔۔۔۔۔ دوالوں کو چاہیئے کہ وہ ہل کی نوک دار پتی کو پانی اور گھی اور شہد یا شکر وغیرہ پیاری چیزوں میں اچھی طرح بھگو کر مضبوط کریں تاکہ وہ زمین کو اچھی طرح کھود سکے۔ اس سے ہم گھی وغیرہ اشیا کو حاصل کر سکیں گے۔ اس پتی کو بار بار پانی میں تر کرنا چاہیئے۔

ادھیا ۱۸ منتر ۱۲ اس سے بھی واضح ہے:۔

میرے چاول اور ساٹھی کے دھان۔ میرے جو اور ارہر، میرے اڑد اور مٹر، میرے تل اور ناریل، میرے مونگ اور اس کا بنانا، میرے چنے اور اس کا سدھ کرنا۔ میری کنگنی اور اس کا بنانا، میرے سو کشم چاول اور ان کا پکانا، میرا ساٹوک اور سنڈا۔ جیسا وغیرہ چھوٹے چھوٹے اناج۔ میرے بغیر بوئے ہوئے چاول اور ان کا پکانا، میری مسور اور ان کے سمندھی اناج۔ یہ سب کے سب تمام اناجوں کے دینے والے پرمیشور سے سامرتھ ہوں۔

تشبیہات بھی اسی قسم کی ہیں۔ مثلاً یجروید۔ ادھیا ۲۸ منتر ۳۲ میں ہے:۔

اے انسانو! جیسے بیل گاؤں کو گابھن کر کے پشوؤں کو بڑھاتا ہے، اسی طرح گرہستی لوگ عورتوں کو حاملہ کر کے پرجا کو بڑھا دیں۔

——— (۲) ———

خدا کا تصوّر

مذہب کی بنیاد خدا کے صحیح تصور اور اس کی توحید پر ہے۔ ظاہر ہے کہ جو مذہب انسانی دماغ کی تخلیق ہو، یا جن الہامی مذاہب میں انسانی دستبرد نے تصرفات کر دیئے ہوں، ان میں خدا کا تصور ذہن انسانی کا تراشیدہ ہوتا ہے اور چونکہ ذہن انسانی محسوسات سے آگے بڑھ نہیں سکتا اس لئے اس کا تخلیق کردہ "خدا" بھی اسی قالب میں ڈھلا ہوا ہوتا ہے۔ ویدوں میں خدا کا تصور کس قسم کا ملتا ہے، اس کا اندازہ اتھروید کانڈ ۱۱ سوکت ۲ منتر ۵-۶ کے صرف ایک اقتباس سے لگ سکتا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ

"اے پشوپتے! جیووں کے سوامی! پرماتما! تیرے مکھ (منہ) کو نمسکار ہے۔ اے پربھو! سراپا دک الیشو! تیری جو چکشو میں (آنکھیں) ہیں ان کو بھی نمسکار ہے۔ تیری توچا (جلد) اور جسم کو نمسکار ہے۔ تیرے سمبنگ درشن روپ پرتیک آتم سوروپ کا نتی۔ تیج کے لئے نمسکار ہے۔ اے پرمیشور! تیرے انگوں (اعضاء) کو نمسکار ہے۔ تیرے ادرھ بھاگ (پیٹ) کو نمسکار ہے۔ تیری جلیجھ (زبان) کو نمسکار ہے۔ تیرے آسیہ

مکھ (چہرے) کو نمسکار ہے۔ تیرے دانتوں کو نمسکار ہے۔ تیرے دانتوں کی گندھ (بو) کو نمسکار ہے۔

دوسرے خدا

ہندوؤں میں برہما، شو اور وشنو تین خدا مانے جاتے ہیں۔ آجکل اس کا یہ مفہوم بتایا جاتا ہے کہ یہ تینوں مستقل خدا نہیں ہیں بلکہ پرماتما کی تین صفتوں کے مظہر ہیں۔ برہما (پیدا کرنے والا) شوجی (سلسلہ کو آگے بڑھانے والا) اور وشنو (ہلاک کرنے والا)۔ ان میں سے شوجی کی پرستش (لنگ کے توسط سے) عام ہوتی ہے۔ لیکن مسٹر گووند داس کی تحقیق یہ ہے کہ برہما، شو، وشنو کا نام ویدوں میں تو ایک طرف رامائن و مہابھارت تک میں بھی نہیں ملتا۔ ویدوں میں ان کی جگہ ورن، اندر اور اگنی کا نام آتا ہے جو اب بالکل بھلائے جا چکے ہیں۔ موجودہ دور میں برہما کی پرستش بالکل غائب ہے۔ پرانوں میں ہے کہ برہما کی پرستش اس لئے بند کر دی گئی ہے کہ "ایک دفعہ شوجی نے دیکھا کہ وہ اپنی لڑکی سرسوتی سے امر شنیع کا مرتکب ہو جانا چاہتا ہے۔" (ہندو ازم صفحہ ۱۸۱)

معاذ اللہ

لیکن ہندوؤں کی مقدس کتابوں مثل شتوپت برہمن، تانڈیا مہا براہمن، مہابھارت اور رامائن وغیرہ میں۔ برہما کے اس فعل کی مذمت نہیں کی گئی۔ مہابھارت اولوگ پرب ادھیائے ۷۵ میں شدید صدر واقعہ کو مثال کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

(وید ارتھ پرکاش صفحہ ۱۰، از پنڈت آتما نند)

یہ تو تھا خدا کے تصور کے متعلق۔ اب رہی خدا کی توحید، تو ہندومت میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ توحید کا مفہوم یہ ہے کہ خدا اپنی ذات اور صفات میں وحدہٗ لاشریک ہے۔ اس کی مثل و نظیر کوئی نہیں۔ اس کی ذات صمدیت کسی کی محتاج نہیں۔ لیکن ہندومت کی تمام اساس ہی دیوتاؤں کی پرستش پر ہے۔ مسٹر گووند داس کی تحقیق کے مطابق،

دیوتا

"ویدوں میں ۳۳ دیوتا تھے لیکن بعد میں ان کی تعداد ۳۳ کروڑ تک پہنچ گئی۔" (ہندو ازم صفحہ ۱۵۹) یہی نہیں کہ ہر کام اور ہر ضرورت کے لئے الگ الگ دیوتا ہو۔ بلکہ ہر چیز کا جدا گانہ دیوتا۔ چنانچہ یجروید کی چوبیسویں ادھیائے میں ہے۔

"تیز رفتار گھوڑے، مار خور بکرے۔ نیل گائے کا دیوتا سورج ہے۔ کالی گردن والے پشو کا دیوتا اگنی ہے۔ داغدار پیشانی والی بھیڑ کا دیوتا سرسوتی ہے۔ کالے رنگ والے تندخو، بائیں اور دائیں طرف سفید دھاریوں والے یا بالکل سیاہ دھاریوں والے پشوؤں کا دیوتا یم ہے۔ جس کے دم پر سفید داغ ہوں اس کا پشو دیوتا وایو ہے۔ بغیر بیاہا ہوتے سانڈ سے جفتی کرنے، حمل استاط کرنے والی گائے کا اور چھوٹے قد اور ٹیڑھے ترچھے اعضاء والے پشو کا دیوتا وشنو ہے۔ سرخ اور سرخی مائل سیاہ رنگ والے اور بیر کے مانند ارغوانی رنگ والے پشوؤں کا دیوتا سوم ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگلی ٹانگوں پر سفید داغوں والے، پچھلے زانوؤں پر سفید داغوں والے پشوؤں کا دیوتا برہسپتی ہے۔ آسمانی رنگ والے پشوؤں کا دیوتا میگھ ہے۔ کالی گردن والے سفید جوڑوں والے، موٹی ٹانگوں والے پشوؤں کا دیوتا پون اور بجلی ہے۔ اونچی آواز والی، اونچی آواز والی اور مدھم آواز والی تین قسم کی بھیڑوں کا دیوتا پرتھوی ہے۔ لال رنگ والوں کا دیوتا رُدر ہے۔ مگرمچھ کے بچے اور مگرمچھ اور دیگر آبی جانوروں کا دیوتا سمندر ہے۔

اتھروید کانڈ ۳، سوکت ۲ منتر ۲ میں ہے:-

سونا دیوتا حاملہ عورتوں کا مالک ہے۔ وہ میری رکشا کرے۔ (۱) اگنی دیوتا جو نباتات کا مالک ہے مجھے محفوظ رکھے۔ (۲) دیو اور زمین جو نعمتوں کی مالکہ ہیں دونوں دیوی میری رکشا کریں۔ (۳) ورن دیوتا جو پانیوں کا مالک ہے میری حفاظت کرے (۴) متر اور ورن نامی دیوتے جو بارش کے مالک ہیں میری رکشا کریں۔ (۵) کرت دیوتے جو پہاڑوں کے مالک ہیں میری حفاظت کریں۔ (۶) سوم دیوتا جو بیلوں کا مالک ہے میری حفاظت کرے۔ (۷) ہوا جو طبقۂ وسطیٰ کی مالک ہے مجھے محفوظ رکھے۔ (۸) سورج دیوتا جو آنکھوں کا مالک ہے میری رکھشا کرے (۹) چاند جو تاروں کا مالک ہے میری حفاظت کرے (۱۰) اندر دیوتا جو دیو لوک کا مالک ہے میری رکھشا کرے (۱۱) مرتوں کا باپ جو حیوانوں کا مالک ہے میری رکھشا کرے۔ (۱۲) موت کا دیوتا جو رعایا یا جانداروں کا مالک ہے میری حفاظت کرے۔ (۱۳) یم راج جو مرے ہوئے پتروں کا مالک ہے مجھے محفوظ رکھے۔

اسی طرح رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۱۲۸ منتر ۱۳ تا ۱۴ میں ہے:۔

چڑھتی ہوئی اشا (شفق) میری رکشا کرے۔ لہروں والے دریا میری حفاظت کریں۔ ساکن پہاڑ میری رکشا کریں اور سورگ میں پہنچے ہوئے میرے پتر میری حفاظت کریں۔ (۴) تمام دیوتا میری اس پکار کو سنیں جو طبقۂ وسطےٰ اور طبقۂ علوی میں ہیں اور جو آگ کی زبان والے اور ہوا والے ہیں وہ میری اس کشا پر آ کر بیٹھیں۔

اسی طرح مختلف ویدوں میں سانپوں کی پرستش، بانجھ گائے کے بالوں اور کھروں کو سجدہ، گھوڑوں اور گھوڑوں کے مالکوں کو سجدہ۔ نائی کے استرے اور سر دی والے بخار کو نمسکار (سجدہ) کرنے کی تلقین موجود ہے۔ اتھروید کانڈ ۲ سوکت ۱ منتر ۳ تا ۴ میں ہموتسر دیوتا کے بت کی پرستش کا ذکر موجود ہے۔ ان تصریحات کے پیش نظر یہ حقیقت نکھر کر سامنے آ جاتی ہے کہ خدا پرستی کے بارے میں ویدوں کی تعلیم کبھی آسمانی تعلیم نہیں کہلا سکتی۔ ہم اس بات کو ایک مرتبہ پھر دہرا دینا چاہتے ہیں کہ ہمیں تسلیم ہے کہ کسی زمانہ میں ہندوستان میں بھی خدا کی طرف سے آسمانی ہدایت کی مقدس قندیل نازل ہوئی ہوگی۔ لیکن وہ حوادث ارضی وسماوی یا انسانی تحریفات سے محفوظ نہ رہ سکی اور جس چیز کو آج آسمانی روشنی کہہ کر پیش کیا جاتا ہے وہ اس دعوے کی تکذیب کی خود زندہ شہادت ہے۔ ہندوستان کی جن مقدس

ہمارا جذبۂ احترام

ہستیوں کو آسمانی ہدایت کی شمع نورانی ملی ہوگی ان کی تعلیم واحترام ہمارا جزوِ ایمان ہے لیکن وہ تعلیم جو ویدوں میں آج موجود ہے اسے ایسی ہستیوں کی طرف کبھی منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ مسٹر گوندداس اس باب میں رقمطراز ہیں۔

ان تمام لوگوں کو جو آج یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارا موجودہ مذہب وہی ہے جو ویدوں کے زمانہ میں تھا اور جو ناقابل تغیر و تبدل ہے ان حقائق پر غائر نگاہ سے غور کرنا چاہئے۔ وہ لوگ جو تاریخ کا اس طرح بطلان کرتے ہیں اور ان مسلسل تغیرات سے چشم پوشی کرتے ہیں سخت غلطی کرتے ہیں اور اپنے آپ کو بھی اور ہندوستان کو بھی سخت نقصان پہنچاتے ہیں۔ (ہندوازم۔ صفحہ ۱۸۶)

معاملات کی دنیا

خدا پرستی سے نیچے اتر کر اگر معاملات کی دنیا میں آیا جائے تو وہاں بھی ویدوں میں

عجیب و غریب قسم کی تعلیم ملتی ہے۔ اس باب میں پھر وہی مشکل ہمارے دامنگیر ہو جاتی ہے جس کی طرف شروع میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس لئے ہم دو ایک مثالوں سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اتھروید کانڈ ۵ سوکت ۱۷ منتر ۸ نیز رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۱۰۹ منتر ۳ میں لکھا ہے کہ

> اگر کسی ایک عورت کے پہلے دس خاوند موجود ہوں۔ اگر برہمن اس کا ہاتھ پکڑ لے تو وہی اکیلا اس کا خاوند سمجھا جائے کیونکہ برہمن ہی عورتوں کا مالک یا خاوند ہے نہ کہ کشتری اور ویش۔

اس ایک حکم سے آپ پوری کی پوری معاشرتی اور عائلی زندگی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ وہی عائلی زندگی جس کے متعلق اتھروید کانڈ ۱۴ سوکت ۲ منتر ۱۸ میں یہ چیز بھی موجود ہے۔

> خاوند سے سنتان کے ابھاؤ (اولاد نہ ہونے) میں دیور کی کامنا (چاہت) کرنے والی عورت۔

اسی بنا پر مہاشی یاسک اچاریہ نے نرکت میں دیور کے معنی ہی دوسرا ور (خاوند) لکھا ہے۔ (ویدارتھ پرکاش صفحہ ۱۳۳)

انہی چیزوں کے پیش نظر مسٹر گوونداس یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ

> ویدوں کی ازلیت اور تقدس کا عقیدہ کسی ایسے شخص کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہو سکتا جس کی نگاہ تاریخ پر ہو۔ یہ عقاید بالکل باطل ہیں۔ ہر اس شخص کے نزدیک جس نے ویدوں کا خالی الذہن ہو کر مطالعہ کیا ہو..... ان کے بے شمار باہمی تضادات۔ ان کے اکثر و بیشتر مہملات، ان کے مضحکہ انگیز بیانات اور فحش نگاری، قدیم ایام میں بھی ان لوگوں کی طرف سے جنہوں نے رائے عامہ کی پرواہ نہ کی سخت تنقید کا مرکز بنی رہی ہے۔ چنانچہ چارواک کے نزدیک ویدوں کے مصنف ....[1] تھے۔
>
> (ہندوازم۔ صفحہ ۸۸ - ۸۷)

(۲)

ویدوں کے علاوہ

ہم نے شروع میں لکھا ہے کہ ویدوں کے علاوہ برہمن، آرنیک اور اُپنشد بھی عہد قدیم کا مقدس لٹریچر تصور کیا جاتا ہے۔ اگر ہندو دھرم میں یہ متعین ہوتا کہ صرف وید ہی مذہب کی مستند کتاب ہیں تو ہمیں ان سے آگے بڑھنے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) ہندومت میں اس امر کا تعین ہی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ان کے ہاں جو جو کتابیں مقدس سمجھی جاتی ہیں، ان کا تذکرہ ہمارے لئے ضروری ہو گیا۔ برہمن ویدوں کی تفاسیر ہیں۔ لیکن عقیدہ یہ ہے کہ یہ تفاسیر بھی الہامی ہیں۔ آرنیک ان رشیوں کے حالات کا مجموعہ ہے جو بستیوں کو چھوڑ کر جنگلوں میں چلے گئے اور چونکہ وہاں قربانیاں کر نہیں سکتے تھے، اس لئے عالمِ تصور میں ان مذہبی رسومات و فرائض کو ادا کرنے لگ گئے۔ لیکن ہندو مذہب میں رشیوں کی حیثیت و منصب کے متعلق بھی کچھ متعین نہیں۔ یعنی جس طرح رسول یا نبی کی حیثیت، مقام اور منصب متعین ہے اور ان کے بعد محدثین و مفسرین، فقہاء وغیرہ کے مناصب و مقامات کے متعلق بھی معلوم ہے کہ وہ کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں۔ اس

---

[1] یہاں جو الفاظ مسٹر گوونداس نے استعمال کئے ہیں انہیں وہ تو لکھ سکتے تھے کہ وہ خود ہندو ہیں۔ لیکن ہم انہیں نقل کرنے کی بھی جرأت نہیں کر سکتے۔

طرح رشیوں کے متعلق کچھ معلوم و متعین نہیں۔ اپ نشد اپنی مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ (BENSSEN) کے نزدیک اس لٹریچر

اپ نشد

کی تقسیم یوں سمجھئے کہ برہمن ان لوگوں کے لئے ہیں جو عائلی زندگی بسر کریں۔ آرنیک ان کے لئے جو بن باس اختیار کرلیں اور اپ نشد ان کے لئے جو ان سے بھی آگے سنیاس کی زندگی شروع کریں جس میں انسان مراقبہ و تصورات میں گیان ایشور (معرفت خداوندی) حاصل کرتا ہے (داس گپتا ص ۲۹)۔ اپ نشد تعداد میں ۱۱۲ ہیں اگرچہ وہ مجموعہ جس کا ترجمہ دارا شکوہ نے کرایا تھا صرف ۵۰ پر مشتمل تھا۔ اپ نشد تمام کی تمام عہد قدیم کی تصانیف نہیں بلکہ ان میں ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا رہا ہے۔ حتیٰ کہ ان میں بعض چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی کی تصانیف بھی ہیں (داس گپتا ص ۳۳)

ویدانت کا فلسفہ جسے سب سے بڑے پرچارک شنکر اچاریہ ہیں[1] انہی اپ نشدوں پر مشتمل ہے۔ ویدانت کی رو سے کمالِ زندگی۔

> ایک ایسی نیند کی سی حالت ہے جس میں خواب تک نہ آئے[2]۔ جسے یہ ابدی سرور حاصل ہو جائے اسے کسی قسم کا خوف نہیں رہتا۔ . . . اس کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہے سب برہما سے نکلا ہے اور برہما ہی میں واپس چلا جائے گا۔ (داس گپتا ۔ ص ۴۲-۴۳)

اور نجات یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو پہچان لے۔ معرفت نفس فی ذاتہ نجات ہے۔ اس سے انسان برہما کے ساتھ ایک ہو جاتا ہے نجات کا مدار اعمال پر نہیں بلکہ معرفت پر ہے۔" (داس گپتا ۔ ص ۵۹-۶۰)

برہمن کے متعلق مسٹر گوند داس کی تحقیق یہ ہے کہ:۔

> ان کی تصنیف میں بھی صدیاں لگی ہیں اور اس عرصہ میں ان میں بھی بہت کچھ حک و اضافہ ہوتا رہا ہے (ہندوازم ص ۶۰) آرنیک کے متعلق یہ صاحب لکھتے ہیں۔

> ان میں بعض عجیب و غریب قسم کی قربانیوں کے احکام ہیں۔ مثلاً برہما میدھ اور مہا ورت۔ ایک نہایت ناپاک تقریب جس میں فحش کاری کا مظاہرہ ہوتا ہے اور انسانی لطف بطور چڑھاوا پیش کیا جاتا ہے۔ (ایضاً ص ۶۰) اور اپ نشدوں کے متعلق:۔

---

[1] ہندوؤں کی اصطلاح میں سرتی وہ الہامی تعلیم ہے جو سینہ بسینہ منتقل ہوتی چلی آئی اور سمرتی مذہب کے بزرگوں کی تصانیف ہیں۔ برہمن، اپ نشد اور آرنیک کے متعلق یہ طے نہیں کہ یہ سرتی ہیں یا سمرتی۔

[2] ویدانت یا وحدت الوجود کا تصوف کا منتہائے نظریہ ہے کہ انسان مکان اور زمان (SPACE AND TIME) کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو جائے تاکہ اس کی ہستی کا قطرہ سمٹ کر یہ برہما (یا ذات واجب الوجود) میں پھر سے جا ملے۔ لیکن یہ جکڑ بندیاں بالخصوص (زمان TIME) کی گرفت) ایسی سخت ہیں کہ ان سے باہر نکلنا ممکن نہیں۔ لیکن ایک ویدانتی اپنے عالم استغراق و محویت میں یہ خیال کر لیتا ہے کہ وہ زمان کی قیود سے آزاد ہو گیا ہے۔ وہ تو جس میں یہ (بزعم خویش) اپنے آپ کو ان تعینات کی حدود سے ماوراء سمجھ لیتا ہے اس کے نزدیک وصال (یعنی اپنی اصل سے مل جانے کا لمحہ) ہے۔ لہٰذا اگر یہ استغراق مستقل ہو جائے تو وصال بھی مستقل (یعنی فنائے کامل) ہو جاتا ہے۔ اسی کا نام ہے ایک ایسی نیند جس میں خواب تک نہ ہو۔ غور فرمائیے کہ یہ فلسفہ کس طرح تصور ہی تصور میں انسان کے ذہن میں ایک نئی دنیا بسا دیتا ہے جس کی حقیقت واہمہ سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ یہ سب کشمکشِ زندگی سے فرار کی نظر فریب راہیں ہیں۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

اپ نشدوں کے مستند ہونے کے متعلق بہت سا طلجان ہے۔ ان کی تعداد تین سو سے بھی زیادہ ہے۔ ان میں سے کون کون سے اصل اور کون کون سے جعلی ہیں یہ سوال ہم دست ہم سے متعلق نہیں ..... یہ یا تو تمام کے تمام اصل ہیں یا تمام کے تمام جعلی۔ اور اس کا فیصلہ اس امر پہ ہے کہ آپ انہیں کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ (یعنی فیصلہ عقیدت پہ ہے) . (صفحہ ۱۰۹)

اپ نشدوں کے متعلق پنڈت جواہر لال نہرو لکھتے ہیں کہ

ان میں بہت سے ابہامات ہیں۔ اور (اس لئے) ان کی بہت سی تفاسیر کی گئی ہیں۔

(THE DISCOVERY OF INDIA. P.66)

شاستر

ان کے بعد ہندوؤں کے عام فلسفے سے متعلق کتابوں کو لیجئے جنہیں شاستر کہا جاتا ہے۔ اس فلسفہ کی دو شاخیں ہیں۔ ایک ناستک اور دوسرا آستک۔ ناستک فلسفے کے مؤید نہ ویدوں کو غلطی سے مبرا مانتے ہیں اور نہ انہیں بطور سند تسلیم کرتے ہیں۔ ناستک میں بدھ مت، جین مت اور چارواک فرقے شامل ہیں (اور سب ہندو قرار دیئے جاتے ہیں) آستک کے چھ مذاہب (SCHOOLS OF THOUGHT) ہیں۔ یعنی سانکھ، یوگ، ویدانت، میمانسا، نیایا، ویشیشک۔ یہ ویدوں کو تنقید سے بالا مانتے ہیں۔ سانکھ کپل کی طرف منسوب ہے جس کی ہستی محض افسانوی ہے۔ یہ خدا کی ہستی کا منکر ہے اور محض عقل کی رُو سے نجات کا حامی۔ اس اسکول کا عہدِ قدیم کا تمام لٹریچر ضائع ہو چکا ہے ۔۔۔ (داس گپتا۔ صفحہ ۲) دوسرا شاستر یوگ ہے جس کا بانی پتنجلی کہا جاتا ہے۔ اس کی رُو سے ایشور (خدا) کو آتما (روح) سے الگ مانا جاتا ہے۔ اس میں حبسِ دم (پرانایم) کو حسنِ عمل قرار دیا گیا جس کی وجہ سے ایسی قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ انسان ہوا پہ اُڑ سکتا ہے، دریا پر چل سکتا ہے، لوگوں کی دل کی بات معلوم کر سکتا ہے۔ تیسرا شاستر ویدانت ہے (جسے اتر میمانسا بھی کہتے ہیں) اسے بیاس دیوجی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کا فلسفہ آپ نشدوں کی تعلیم کا ماحصل ہے جس پر سارے ہندو تصوف کی بنیاد ہے۔ اس کی رُو سے کائنات کی ہر شے برہم ہے۔ (یعنی جو نسبت مٹی کو برتن سے اور موج کو دریا سے ہے وہی نسبت موجودات کو خدا سے ہے۔) انسان کا کمال یہ ہے کہ مادہ کو ترک کر کے برہما میں جذب ہو جائے۔ چوتھا شاستر میمانسا (یا پورب میمانسا ہے) جو جیمنی جی کی تصنیف بتایا جاتا ہے۔ اس میں قربانی سے متعلق احکام ہیں اور انسان کو مختارِ بالارادہ قرار دیا گیا ہے، اس حد تک کہ یہ خدا کا بھی قائل نہیں۔ (منوسمرتی کے قوانین جو آجکل (HINDU LAW) کی حیثیت لئے ہوئے ہیں، اسی شاستر کے مطابق ہیں)۔ (داس گپتا۔ صفحہ ۲/۳۷۰، ۴۰)۔ پانچواں شاستر نیایا ہے جو گوتم یا نیائک کا مرتب کردہ ہے۔ اس میں انسان کو مجبورِ محض بتایا گیا ہے اور منطق کو ایک خاص حیثیت دی گئی ہے۔ چھٹا شاستر ویشیشک ہے جس کا مصنف کناد ہے۔ اس میں طبیعیاتی اور ماوراء الطبیعیاتی مسائل سے بحث کی گئی ہے۔

فلسفہ کی ان تمام شاخوں میں قدرِ مشترک متشائم نظریۂ حیات (PESSIMISM) ہے۔ "خوشی در اصل خوشی نہیں وہ بھی غم ہی کا پیش خیمہ ہے۔ اصل خوشی خواہشات کے ترک میں ہے۔" (داس گپتا۔ صفحہ ۷۹)

پُران

پران بھی ہندوؤں کی مقدس کتابیں ہیں۔ برہما نند پران کی رُو سے شروع میں وید کی طرح پران بھی ایک ہی تھا جسے ویاس جی نے ویدوں کی ترتیب کے بعد تصنیف کیا تھا۔ ویاس جی کے شاگردوں نے اس ایک سے چار پران

ﻟﮧ حالانکہ ڈاکٹر داس گپتا نے صرف ۱۱۲ لکھا ہے۔

مرتب کر لئے۔ اس کے بعد ان کی تعداد اٹھارہ تک بڑھ گئی۔ اٹھارہ سے چھتیس، چھتیس سے چوّن، اور اس کے بعد ساٹھ تک جا پہنچی۔ شروع میں ان کے کل اشلوکوں کی تعداد قریب چار ہزار تھی۔ اب دس لاکھ سے بھی زیادہ ہیں۔ یہ "پران" اپنی موجودہ شکل میں سب ایک دوسرے سے متضاد ہیں" (ہندوازم۔ صفحہ ۱۱۱) حتیٰ کہ کسی پران کے دو نسخے بھی آپس میں نہیں ملتے۔" (ایضاً۔ صفحہ ۱۱۹) پران عجیب و غریب افسانوں کے مجموعے ہیں۔ ان میں دس دس ہزار اور ساٹھ ساٹھ ہزار سال کی عمر کے انسان عام طور پر ملتے ہیں" (ایضاً۔ صفحہ ۱۳۳)۔ ان کی تعلیم کا اندازہ لگانے کے لئے ایک دو مثالیں کافی ہوں گی۔ کیونکہ ان سے آگے بڑھنے میں وہی دشواری مانع ہے جس کا شروع میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ پدم پران میں ہے کہ برہما (یعنی ہندوؤں کے عقیدہ کی رُو سے خالق کائنات)، اہنکاری (معاذ اللہ شہوت پرست) ہے۔ اس نے اپنی بیٹی سرسوتی کی طرف بُری نگاہ سے دیکھا، تب اس کی بد دعا سے اس کے منہ سے فحش جاری ہوا۔ شو پران میں ہے کہ

شو جی نے خواہش کی کہ میں دنیا کو پیدا کروں۔ اس نے برہما کو پیدا کیا۔ برہما نے ایک چلّو پانی اٹھا کر پانی میں پھینک دیا۔ اس سے ایک بلبلا اٹھا۔ بلبلے ہی سے ایک آدمی پیدا ہوا۔ اس نے برہما سے کہا: "اے بیٹے! دنیا کو بنا۔" برہما نے کہا۔ میں تیرا بیٹا نہیں بلکہ تو میرا بیٹا ہے۔" دونوں میں جھگڑا برپا ہوا۔ مہادیو (شو جی) نے سوچا کہ جن کو میں نے دنیا بنانے کے لئے بھیجا تھا وہ دونوں آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔ تب ان دونوں کے بیچ میں سے ایک نورانی لنگ پیدا ہوا اور فوراً وہ آسمان میں چلا گیا۔ اس کو دیکھ کر دونوں حیران رہ گئے۔

دونوں سوچنے لگے کہ اس لنگ کا شروع اور آخر معلوم کرنا چاہیئے۔ جو پہلے آئے وہ باپ جو پیچھے آئے وہ بیٹا کہلائے۔ وشنو کچھوے کی شکل بنا کر لنگ کا پتہ لگانے کے لئے نیچے کو چلا اور برہما ہنس کا جسم بنا کر اوپر کو اڑا۔ دو ہزار برس دونوں من کی سی تیز رفتار سے چلتے رہے مگر لنگ کی حد نہ ملی۔ برہما نے سوچا اگر وشنو پتہ لے آیا ہوگا تو مجھ کو اس کا بیٹا بننا پڑے گا۔ وہ ایسا سوچ ہی رہا تھا کہ اسی وقت ایک گائے اور کیتکی کا درخت اوپر سے اترا۔ برہما نے ان سے پوچھا کہ تم کہاں سے آئے ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم ہزاروں برس سے اس لنگ کے سہارے چلے آئے ہیں۔ برہما نے پوچھا کہ اس کی کوئی حد ہے یا نہیں۔ انہوں نے کہا کہ نہیں۔

برہما نے کہا کہ میرے ساتھ چل کر ایسی گواہی دو کہ گائے اس لنگ کے سر پر دودھ کی دھار بہاتی تھی اور درخت کہے کہ میں پھول برساتا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ہم جھوٹی گواہی نہیں دیں گے تب برہما خفا ہو کر بولا کہ اگر گواہی نہیں دو گے تو میں تم کو ابھی خاکستر کر دوں گا۔ تب دونوں نے ڈر کر کہا کہ جیسے تم کہتے ہو، ویسی ہی گواہی دیں گے۔ تب تینوں نیچے کی طرف چلے۔

برہما نے وشنو سے سوال کیا کہ تو نے اس لنگ کی حد معلوم کی یا نہیں۔ اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ برہما نے کہا کہ میں پتہ لے آیا ہوں۔ وشنو نے کہا کہ کوئی گواہی دو۔ تب گائے اور درخت نے جھوٹی گواہی دی۔ اس پر لنگ نے کیتکی کو بد دعا دی کہ تو نے جھوٹ بولا ہے۔ تیرا پھول مجھ پر یا کسی دیوتا پر کبھی نہیں چڑھے گا۔ جو کوئی چڑھائے گا، اس کا ستیاناس ہوگا۔ گائے کو بد دعا دی کہ جس منہ سے

تو نے جھوٹ بولا ہے تو اس منہ سے پاخانہ کھایا کریگی۔ تیرے منہ کی پرستش کوئی نہیں کرے گا لیکن ہم کی کرینگے۔ برہما کو بد دعا دی کہ تو نے جھوٹ بولا ہے اس لئے تیری پرستش دنیا میں کبھی نہیں ہوگی وشنو کو دعا دی کہ تو نے سچ بولا ہے اس لئے تیری پرستش سب جگہ ہوگی۔ پھر دونوں نے لنگ کی حمد و ثنا کی۔

اس حمد و ثنا کو سن کر لنگ میں سے ایک جٹا جوٹ صورت نکل آئی اور کہنے لگی کہ میں نے تم کو خلقت پیدا کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ تم جھگڑے میں کیوں پڑ گئے۔ تب مہادیو نے بالوں میں سے ایک راکھ کا گولا نکال کر دیا اور کہا کہ جا کر اس سے خلقت پیدا کرو۔

(بحوالہ ستیارتھ پرکاش۔ سوامی دیانند جی۔ صفحہ ۲۷۲-۲۷۳)

دیوی بھاگوت میں ایک عورت کی کتھا لکھی ہے:-

اسی نے سب دنیا کو بنایا اور برہما وشنو سادیو کو بھی اس نے پیدا کیا۔ جب اس دیوی کو خواہش ہوئی تو اس نے اپنا ہاتھ گھسا۔ اس سے ہاتھ میں ایک آبلہ پیدا ہوا۔ اس میں سے برہما کی پیدائش ہوئی۔ اس سے دیوی نے کہا۔ تو مجھ سے شادی کر۔ برہما نے کہا۔ تو میری ماں ہے۔ میں تجھ سے شادی نہیں کر سکتا۔ یہ سن کر ماں کو غصہ آیا اور لڑکے کو جلا کر خاک کر دیا۔ دیوی نے اسی طرح پھر ہاتھ گھس کر دوسرا لڑکا پیدا کیا۔ اس کا نام وشنو رکھا۔ اس کو بھی اپنے ساتھ شادی کرنے کے لئے کہا۔ مگر اس نے بھی نہ مانا۔ چنانچہ اس کو بھی راکھ کر دیا۔ پھر اس نے تیسرے لڑکے کو پیدا کیا۔ اس کا نام مہادیو رکھا۔ اس سے بھی کہا کہ تو مجھ سے شادی کر۔ مہادیو بولا۔ "میں تجھ سے شادی نہیں کر سکتا۔ تو دوسرا جنم بدلے تو شادی کر لوں گا۔" چنانچہ مہادیو نے ایسا ہی کیا۔

مہادیو بولا کہ یہ دو جگہ راکھ کیسی پڑی ہے۔ دیوی نے کہا کہ یہ دونوں تیرے بھائی ہیں۔ انہوں نے میرا حکم نہیں مانا تھا اس لئے راکھ کر دیئے ہیں۔ مہادیو نے کہا کہ میں اکیلا کیا کروں گا ان کو زندہ کر دے اور دو عورتیں اور پیدا کر پھر تینوں کی شادی تینوں سے ہوگی۔

(بحوالہ ستیارتھ پرکاش۔ سوامی دیانند جی۔ صفحہ ۳۴۳)

پرانوں کی تعلیم کی مزید تفصیلات کے لئے ستیارتھ پرکاش دیکھنی چاہیئے جس میں سوامی دیانند نے ان کتابوں کی مضحکہ خیز اندازسے تردید کی ہے اور انہیں سخت ناقابل اعتبار قرار دیا ہے۔ جہاں تک ان کے دھرم شاستر ہونے کا تعلق ہے اس کی بابت مسٹر آر سی۔ دت اپنی مشہور کتاب (A HISTORY OF CIVILISATION OF ANCIENT INDIA VOL. II) میں لکھتے ہیں:-

ان دھرم شاستروں کے متعلق بھی ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ وہ پورانک تہذیب کے آئینہ دار ہیں۔ ان میں سے بعض تو پورانک زمانہ کے ہیں لیکن ان میں بھی مسلمانوں کی فتوحات کے زمانہ کے بعد بہت سی آمیزش ہو چکی ہے۔ (صفحہ ۱۹۷)

———— (۰) ————

رامائن و مہابھارت

ان کے علاوہ ہندوؤں کے ہاں رامائن و مہابھارت بھی بڑی مقدس کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔ حالانکہ ان کے مضامین سے ظاہر ہے کہ وہ صرف تاریخی کتابیں ہیں۔ (تاریخی بھی صرف اس لحاظ سے کہ ان میں دو لڑائیوں کا ذکر ہے) ان کے زمانہ تصنیف کی تعیین بھی مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ عام طور پر ہندوؤں کا خیال ہے کہ رامائن، مہابھارت سے بہت پہلے کی تصنیف ہے۔ پنڈت لیکھرام صاحب تاریخ دنیا میں مہابھارت کی تصنیف کا زمانہ ۵۰۰۰ ق م بتاتے ہیں اور رامائن کو آٹھ لاکھ برس کی پرانی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ لیکن یورپین مؤرخین (مثل ڈاکٹر ہنٹر وغیرہ) کا خیال ہے کہ رامائن کی تصنیف کا زمانہ مہابھارت کے بعد کا ہے۔ ڈاکٹر ہنٹر کی تحقیق ہے کہ رامائن ۵۰۰ ق م یا اس سے بھی بعد کی تصنیف ہے اور مہابھارت قریب ۱۲۰۰ ق م میں لکھی گئی۔ لیکن ان دونوں کتابوں میں سن عیسوی کے سینکڑوں سال بعد تک الحاقات ہوتے رہے۔ چنانچہ مہابھارت میں راجہ تلی کا ذکر موجود ہے جو چوتھی صدی عیسوی میں گزرا ہے۔ رامائن کے متعلق مسٹر گووند داس اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس کی تصنیف کا زمانہ قریب تیسری صدی ق م کا ہے۔ (ہندوازم صفحہ ۱۳۱) اگرچہ ہندوؤں کے عقیدہ کی رو سے مہاراج رام چندر جی کا زمانہ آج سے قریب بیس لاکھ سال پیشتر کا مانا جاتا ہے۔ (ایضاً صفحہ ۱۳۲)

رامائن مختلف مصنفوں نے لکھی ہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے اخیر پر رامائن کے قریب بیس مختلف نسخے فقط بنارس کے ایک کتب خانہ میں موجود تھے جن میں سے ہر ایک میں واقعہ متعلقہ کی بابت بہت کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن ویاس، کالیداس، ہیم چندر وغیرہ کی رامائن کے مقابلہ میں والمیکی کی رامائن بہت مشہور ہے۔ لیکن اس کی بھی یہ حالت ہے کہ:

> اس میں پہلا اور ساتواں باب بعد کا اضافہ ہے اور باقی متن کی بھی حالت یہ ہے کہ اس میں بے حد رد و بدل ہو چکا ہے۔ اگرچہ اتنا نہیں جتنا مہابھارت میں ...... یہ بھی یاد رہے کہ یہ محض شاعری ہے تاریخ نہیں۔
>
> (ہندوازم۔ صفحہ ۱۳۱، ۱۳۲)

رامائن اور مہابھارت کے متعلق پنڈت جواہر لال نہرو لکھتے ہیں کہ:

> "یہ کتابیں سینکڑوں برس کے عرصہ میں جا کر مکمل ہوئیں اور اس کے بعد بھی ان میں اضافے ہوتے رہے۔"
>
> (THE DISCOVERY OF INDIA P. 75)

رامائن کی تفاصیل

رامائن کی رو سے راجہ دشرتھ (مہاراج رام چندر جی کے والد بزرگوار) کی تین بیویاں اور ساڑھے تین سو لونڈیاں تھیں (ہندوازم صفحہ ۱۳۳) جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے ان کی عمر ساٹھ ہزار سال کی تھی جب ان کے ہاں چار لڑکے پیدا ہوئے (صفحہ ۱۳۳) جب مہارانی سیتا کا سوئمبر رچایا گیا، تو ان کی عمر پانچ برس کی تھی۔ اور جب ان کی عمر دس ہزار تینتیس سال کی ہوئی تو ان کے ہاں پہلا لڑکا پیدا ہوا (صفحہ ۱۳۳) اس میں کس قسم کے قصے کہانیاں ہیں؟ اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے لگائیے جو مہاراج رام چندر جی کی پیدائش سے متعلق ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ

> مہاراجہ دشرتھ کے تین رانیاں کوشلیا، کیکئی اور سومترا تھیں۔ لیکن کسی سے کوئی بیٹا پیدا نہیں ہوا۔ لہذا بیٹے کی تمنا میں راجہ نے اشومیدھ جگ کیا جس کا قاعدہ یہ تھا کہ جگ کرنے والے کی رانی قربانی ہونے والے گھوڑے کو بلدان کرتی تھی اور اس گھوڑے کے ساتھ ایک رات رہتی تھی۔ چنانچہ کوشلیا نے گھوڑے کے

ساتھ مراسم ادا کئے۔ پھر گھوڑے کو جلب میں چڑھایا گیا، یعنی اس کی سوختنی قربانی عمل میں آئی۔ پھر کیا دیکھتے ہیں کہ جگ ویدی یعنی مذبح کی آگ میں سے ایک قوی ہیکل شخص سونے کی تھال میں کھیر لے کر نکل آیا، اور راجہ دشرتھ سے بولا کہ یہ کھیر اپنی رانیوں کو کھلا دے۔ وہ تیرے لئے بیٹے جنیں گی۔ پس راجہ نے آدھی کھیر کوشلیا کو آدھی باقی رانیوں کو کھلا دی اور رانیاں حاملہ ہو گئیں۔ اور وشنو جی مہاراج چار حصے ہو کر ان رانیوں سے اس طرح پیدا ہوئے کہ کوشلیا سے رام، کیکئی سے بھرت اور سومترا سے لچھمن اور شتروگھن۔ یہ چاروں بڑے ہوئے تو رام اور لچھمن میں بہت رفاقت پیدا ہوئی۔ اسی طرح بھرت اور شتروگھن آپس میں ایک دوسرے کے زیادہ رفیق تھے۔ (مقدمہ تاریخ ہند قدیم، صفحہ ۱۳)

یہ قصہ کی ابتدا تھی۔ اور اس کی انتہا یہ ہے کہ جب لنکا فتح کرنے کے بعد مہاراج رام چندر جی اجودھیا میں واپس آئے اور مہارانی سیتا کے ساتھ اپنے دارالسلطنت میں رہنے سہنے لگے تو

ایک روز سیتا جی نے تپوبن کے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی جہاں بالمیک رشی کا قیام تھا۔ رام نے لچھمن جی کو بلا کر حکم دیا کہ کل سیتا جی کو رتھ میں سوار کر کے تپوبن کی سیر کرا لاؤ۔ یہ ایک رات وہاں قیام کریں گی پھر واپس آجائیں گی۔ اتفاقاً رات کو درمکھ نامی جاسوس نے حسب معمول تنہائی میں رام چندر جی کو اپنی رپورٹ سنائی اور رعایا کے حالات سے آگاہ کیا۔ اسی سلسلے میں اس نے کہا کہ آج میں نے ایک چمار اور چمارن میں جھگڑا ہوتے سنا۔ چمار نہایت حسرت کے ساتھ کہہ رہا تھا کہ اب عورت کو بس میں رکھنا ہمارے لئے دشوار ہو گیا ہے اس لئے کہ ہمارے راجہ نے ایسا برا نمونہ دکھایا ہے کہ اپنی رانی کو جو راون کے ساتھ فرار ہو گئی تھی پھر اپنی رانی بنا کر گھر میں رکھ لیا ہے۔ جب راجہ ہی عورت کے معاملے میں اس قدر کمزور ہے تو رعایا کیوں نہ متاثر ہو گی۔ یہ حال سنا کر درمکھ زار و قطار رونے لگا۔ رام جی بھی بہت متاثر ہوئے۔ اس کو رخصت کر کے اپنے تینوں بھائیوں کو بلا کر سب حال سنایا اور کہا کہ میں نے اب یہ فیصلہ کیا ہے کہ صبح لچھمن جب سیتا کو تپوبن لے جائے تو یہاں کچھ نہ کہے تپوبن میں پہنچا کر کہہ دے کہ رام نے تم کو طلاق دے دی ہے۔ اب رام کو تم سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ سنا کر اور سیتا کو وہاں چھوڑ کر واپس چلا آئے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور سیتا جو حاملہ بھی تھی بے یار و مددگار اس جنگل میں روتی ہوئی رہ گئی۔ بالمیک رشی کو معلوم ہوا تو وہ اپنی جھونپڑی میں لے گئے۔ وہاں سیتا کے دو جڑواں بیٹے پیدا ہوئے جن کے نام لو اور کش رکھے گئے۔ یہ دونوں لڑکے بالمیک رشی کے پاس تپوبن میں پرورش پا کر جوان ہوئے اور بالمیک جی نے جو اسی عرصے میں رام چندر جی کی مذکورہ داستان یعنی رامائن تصنیف کر رہے تھے، ان دونوں لڑکوں کو زبانی یاد کرا دی۔ ادھر رام چندر جی چند روز کے بعد سیتا کو بھول گئے اور کاروبار ریاست میں مصروف ہوئے۔ ایک روز ایک برہمن نے آ کر عرضی دی کہ میرا بیٹا چھوٹی ہی عمر میں فوت ہو گیا۔ یہ دلیل اس بات کی ہے کہ آپ کے راج میں کوئی خرابی ضرور ہے۔ رام چندر جی یہ سن کر بہت رنجیدہ ہوئے اور رات دن اس تلاش میں رہنے لگے کہ میرے راج میں کون سی خرابی ہے۔ آخر انہوں نے ایک تالاب کے کنارے ایک سنیاسی کو دیکھا کہ سر نیچے اور پاؤں اوپر کئے ہوئے ایک درخت میں لٹکا ہوا ہے۔ رام نے پوچھا تو کون ہے اور ریاضت کیوں کر رہا ہے؟ سنیاسی بولا۔ میں ذات کا شودر ہوں۔ میں نے اس لئے یہ سخت مجاہدہ اختیار کیا ہے کہ اسی جسم کے ساتھ سورگ

دبہشت) میں پہنچوں "۔ یہ سن کر رام چندر جی کو بہت غصہ آیا اور یہ کہتے ہوئے کہ او پاپی تو شودر ہو کر دوج ورن یعنی اونچی ذات والوں کے کام کر رہا ہے، تلوار کے ایک ہی وار سے اس کا سر اڑا دیا۔ یہ حسن عمل دیکھ کر دیوتاؤں نے اظہارِ خوشنودی کے لئے رام چندر جی پر پھول برسائے۔ چند برسوں کے بعد رام چندر جی نے اشومیدھ جگ (گھوڑے کی قربانی) کا سامان کیا۔ اس متبرک جشن میں شریک ہونے کے لئے لو اور کش بھی درویشانہ لباس میں والمیک جی کے حسبِ منشا اجودھیا پہنچے اور رام چندر جی کو رامائن کے اشعار جوان کو یاد تھے سنائے۔ جب رام چندر جی کو معلوم ہوا کہ یہ دونوں نوجوان انہی کے بیٹے ہیں تو انہوں نے سیتا جی کو بلانے کا ارادہ کیا۔ دوسرے دن سیتا جی بھی بالمیک جی کے ہمراہ آگئیں اور بالمیک جی نے مجمع عام میں سیتا جی کی پاک دامنی کی گواہی دی۔ رام چندر جی نے کہا کہ اس میں شک نہیں کہ بالمیک جی جو کچھ فرماتے ہیں وہ صحیح ہے۔ لیکن ضرورت اس کی ہے کہ خود سیتا جی اپنی پاک دامنی کا کوئی ناقابلِ استثنا ثبوت پیش کریں۔ سیتا جی نے اٹھ کر قسم کھائی کہ میں نے رام کے سوا کسی دوسرے شخص کا خیال بھی نہیں کیا۔ اور اے دھرتی ماتا تو میرے اس بیان کی صداقت کا ثبوت پیش کر کے مجھے ابھی نگل جا۔ سیتا جی کا کہنا تھا کہ زمین پھٹی اور اس میں سے ایک تخت نکلا۔ سیتا جی فوراً اس تخت پر بیٹھ گئیں اور تخت مع سیتا جی زمین میں سما گیا۔ اس طرح سیتا جی کا خاتمہ ہوا۔ اس واقعہ کے دس ہزار سال بعد تک رام چندر جی زندہ اور برسرِ حکومت رہے۔

(مقدمہ تاریخ ہند قدیم - صفحہ ۱۴۸ - ۱۵۰)

اور اس قسم کی باتیں بھی لکھی ہیں:-

برہما کی بیٹی اہلیا جو گوتم رشی کی بیوی تھیں۔ اس کے ساتھ اندر دیوتا نے جو گوتم رشی کے شاگرد تھے، نامناسب برتاؤ کیا اور گوتم رشی نے اندر کو بد دعا دی جس سے ان کے جسم پر ایک ہزار علاماتِ تانیث نمودار ہوئیں اور اہلیا کو پتھر کا بنا دیا۔ (ایضاً - صفحہ ۱۳۸)

ہندوؤں کے ہاں رسول کا صحیح تصور نہیں ملتا۔ وہ اپنے مشاہیر کو خدا کا اوتار سمجھ کر ان کی پرستش کرتے ہیں۔ چنانچہ رام چندر جی کی بھی اسی طرح سے پرستش ہوتی ہے۔ لیکن اب خود ہندوؤں کے دلوں میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہے کہ ایک انسان کس طرح سے خدا ہو سکتا ہے؟ ہندوؤں کے سیاسی اور مذہبی رہنما مہاتما گاندھی، رام نام کی پرستش کیا کرتے تھے اور اپنی پرارتھنا میں اس کی تلقین بھی کرتے تھے۔ اس ضمن میں ذیل کا سوال اور اس کا جواب ان کے اخبار ہریجن بابت ۲۲ ستمبر ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئے تھے۔ سوال کرنے والا ایک ہندو تھا اور جواب مہاتما گاندھی کے قلم سے تھا۔

سوال ہے:- وہ رام جسے آپ (مہاتما گاندھی) غیر فانی سمجھتے ہیں، کس طرح دسرتھ کا بیٹا اور سیتا کا خاوند ہو سکتا ہے؟

جواب ہے: سنت تلسی نے بھی یہ سوال اٹھایا ہے اور اس کا خود ہی جواب بھی دیا ہے۔ اس جواب کو عقلی طور پر سمجھایا نہیں جا سکتا۔ اس سے عقلی تشفی نہیں ہو سکتی۔ یہ تو دل کی بات دل سے ہے۔ میں بھی ابتدا میں اس رام کی پرستش کرتا تھا جو سیتا کا خاوند ہے۔ لیکن جوں جوں خدا کے متعلق میرا علم اور تجربہ بڑھتا گیا وہ رام غیر فانی اور حاضر و ناظر ہوتا گیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب وہ رام سیتا کا خاوند نہیں رہا۔ لیکن رام کے تصور کی

وسعت سے سیتا کے خاوند کا مفہوم بھی وسیع ہوتا چلا گیا...... اس شخص کے لئے رام کبھی حاضر وناظر نہیں ہو سکتا جو اسے صرف دسرتھ کا بیٹا سمجھتا ہے۔ لیکن جو شخص رام کو خدا مانتا ہے' اس کے لئے اس حاضر وناظر خدا کا باپ بھی حاضر وناظر ہو جاتا ہے۔ باپ اور بیٹا ایک ہو جاتے ہیں...... جب ہمیں صحیح علم حاصل ہو جاتا ہے تو انسان کی حقیر سی خودی فنا ہو جاتی ہے اور سب کچھ خدا ہو جاتا ہے۔ اس وقت رام دسرتھ کا بیٹا، سیتا کا خاوند، بھرت اور لکھشمن کا بھائی ہوتا ہے اور نہیں بھی ہوتا اور اس کے باوجود غیر مخلوق اور ازلی خدا بھی ہوتا ہے...

رام کا مسئلہ ایسا ہے جو عقلی حدود سے ماوراء ہے۔

یہ جواب کسی تبصرہ کا محتاج نہیں۔

(۰)

مہابھارت

مہابھارت کو دیاس جی کی تصنیف بتایا جاتا ہے جنہوں نے اس جنگ کے حالات بچشم خویش دیکھ کر لکھے تھے۔ اگر یہ صحیح ہے تو مہابھارت کی جنگ کا واقعہ قریب ۳۱۰۰ ق م کا قرار دیا جا سکتا ہے۔ مہابھارت کے موجودہ نسخوں کے متعلق مسٹر گووند داس لکھتے ہیں :۔

ان میں بڑے بڑے اختلاف پائے جاتے ہیں۔ تین مختلف مرتب شدہ کتابوں کا ذکر تو خود مہابھارت کے اندر موجود ہے۔ (ہندو ازم ۔ صفحہ ۱۳۱)

اس کتاب میں ہستناپور کی ریاست کے لئے دو رشتہ دار خاندانوں (کورو پانڈو) کی جنگ کا ذکر ہے جو اٹھارہ دن تک رہی اور جس میں کہا جاتا ہے کہ مختلف اندازوں کے مطابق (۱۹۹، ۴۷، ۸۲) آدمی مارے گئے (ہندو ازم صسا۱۳۱) مہابھارت کے متعلق خود اس کے آدھ پرب ادھیائے اول میں لکھا ہے کہ پہلے زمانہ میں دیوتاؤں نے مل کر ترازو کے ایک پلڑے میں چار وید اور دوسرے میں مہابھارت کو رکھا۔ مہابھارت کا وزن چاروں ویدوں سے زیادہ نکلا۔ نیز اس میں لکھا ہے کہ اس کتاب میں پورے ساٹھ لاکھ اشعار ہیں جن میں سے تیس لاکھ اشعار دیولوک (عالم بالا) میں پڑھے جاتے ہیں۔ پندرہ لاکھ پتری لوک میں، چودہ لاکھ گندھرو لوک میں اور باقی ایک لاکھ منش لوک (انسانوں کی دنیا) میں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو مہابھارت اس دنیا میں موجود ہے اس کے ایک لاکھ اشعار ہیں، لیکن بیبان نے ان اشعار کی گنتی دو لاکھ پندرہ ہزار بتاتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ مہابھارت میں مختلف ادوار میں اضافے ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ بھگوت گیتا، شکنتلا، رگھوبنس، میگھ دوت وغیرہ متعدد رسالے مہابھارت کا جزو بن چکے ہیں۔ مہابھارت میں لکھا ہے کہ

دروپدی کے پانچ خاوند تھے۔

(۱) یدھشٹھیر۔ (۲) بھیم سین، (۳) ارجن۔ (۴) نکل۔ (۵) سہدیو۔ اور ان پانچوں خاوندوں سے ایک ہی بیوی' دروپدی' سے علی الترتیب پانچ بیٹے بھی پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ مہاراجہ یدھشٹر کے فرزند کا نام (۱) پرتی وندیہ اور بھیم سین کے ارجمند کا نام (۲) سوت سوم۔ اور مہاراجہ ارجن کے بیٹے کا نام (۳) سترت کرما۔ اور نکل کے برخوردار کا نام (۴) شتانیک جس کا ذکر اتھرو وید کانڈ ۱۰ سوکت ۵ منتر ۲ میں بھی پایا جاتا ہے اور سہدیو کے بیٹے کا نام (۵) سترت آستشن لکھا ہے۔ چنانچہ جب راجہ دروپد اپنی بیٹی کے پانچ خاوند سن کر افسوس کرنے لگا تو مہرشی دیاس جی نے فرمایا اے دروپد! تو افسوس نہ کر۔ کیونکہ ایک عورت کے ایک ساتھ انیک (متعدد)

خاوند ہونا عین ویدک دھرم ہی ہے۔

(مہابھارت آدی پرب ادھیائے ۱۹۵ وغیرہ بحوالہ ویدارتھ پرکاش صفحہ ۱۴۳)

ایک عورت کے متعدد خاوندوں کے متعلق دیگر مقامات سے بھی شواہد ملتے ہیں۔ مہابھارت ہی میں لکھا ہے کہ پرانوں کی روایت کے مطابق نرسی کنیا سے سات رشیوں نے ایک ساتھ بیاہ کیا تھا۔ نیز وارکشی نامی منی کنیا سے پرچیتا نامی دس برہمن بھائیوں نے ایک ساتھ نکاح کیا تھا۔ یہ بھائی ویدوں کے مصنف (رشی) بھی ہیں۔ (ویدارتھ پرکاش صفحہ ۱۴۳)

نیز مہابھارت ادیوگ پرب ادھیائے ۱۱۰-۱۲۰ میں لکھا ہے کہ

گالب منی اپنے گرو وشوامتر رشی کو رو دکشنا دینے کے لئے نہش کے بیٹے ییاتی راجہ کے پاس کالے کانوں والے آٹھ سو گھوڑے مانگنے کے لئے گئے۔ ییاتی نے ایسے گھوڑے نہ ہونے سے معذور ہو کر اپنی خوبصورت بیٹی مادھوی نامی گالب کے حوالے کر کے کہا کہ میرے پاس تو شیام کرن یعنی کالے کانوں والے آٹھ سو گھوڑے نہیں ہیں اس لئے تو میری بیٹی کو دے کر ایسے گھوڑے لے جا۔ گالب پہلے مادھوی کو کاشی کے راجہ ہرلشو کے پاس لے گیا اور اس سے بیاہ کر کے ۲۰۰ کالے کانوں والے گھوڑے حاصل کئے۔ چنانچہ راجہ ہرکیشو جب مادھوی سے وسومنا نامی بیٹا پیدا کر چکا تو پھر گالب منی نے مادھوی کا بیاہ دوو داس راجہ سے کر کے ۲۰۰ مزید گھوڑے حاصل کئے اور جب راجہ دوو داس بھی مادھوی سے پرتردن نامی بیٹا پیدا کر چکا تھا، تب پھر گالب منی نے مادھوی کا بیاہ راجہ اشی نر سے کر کے ۲۰۰ مزید شیام کرن گھوڑے حاصل کئے۔ اور جب راجہ اشی نر بھی مادھوی میں شوی نامی بیٹا پیدا کر چکا تو پھر گالب منی چھ سو شیام کرن گھوڑے اور مادھوی کو اپنے گرو وشوامتر کے پاس لے گیا۔ وشوامتر نے کہا کہ اے گالب! تم نے پہلے ہی اس خوبصورت لڑکی جیسے بیش بہا ہیرے کو مجھے ہی کیوں نہ دے دیا۔ ایسا ہونے سے میں آپ ہی کیوں نہ کل پوتر کرنے والے چار پتروں کو اتپن (پیدا) کر لیتا۔ جو ہو اس وقت ایک ہی بیٹا پیدا کرنے کے لئے اس خوبصورت لڑکی کے ساتھ بیاہ کرتا ہوں؟ چنانچہ وشوامتر جیسے مہاتما رشی نے بھی مادھوی سے بیاہ کر کے جب اشٹک نامی بیٹا پیدا کر لیا تو پھر اسی مادھوی کا سوئمبر رچنے کے لئے اس کے دونوں بھائی (پریاگ) (الٰہ آباد) گئے اور مادھوی کا نکاح ارینہ نامی راجہ سے کر دیا گیا۔ اس طرح مادھوی بنت ییاتی کے پانچ خاوند (۱) ہرکیشو (۲) دوو داس (۳) اشی نر (۴) وشوامتر (۵) ارینہ نامی تھے۔ جن میں سے پہلے چاروں کے بیٹے (۱) وسومنا (۲) پرتردن (۳) شوی (۴) اشٹک پیدا ہوئے۔

(ویدارتھ پرکاش۔ صفحہ ۱۴۲-۱۴۱)

(۱)

رامائن کی طرح مہابھارت کے متعلق بھی اب ہندوؤں کے دلوں میں طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا ہو رہے ہیں جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ یہ جنگ چچازاد بھائیوں میں تخت و تاج کے جھگڑے پر واقع ہوئی تھی۔ لیکن اسے مقدس جنگ قرار دیا جاتا ہے۔ اس باب میں بھی مہاتما گاندھی کے اخبار ہریجن (بابت ۲۲ ہ۔۴۶ء) میں حسب ذیل سوال و جواب شائع ہوئے تھے۔

سوال ۱۔ مہابھارت کی جنگ کو دھرم یدھ یعنی مقدس جنگ کہا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ جنگ باہمی خون خرابہ سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ ہو نہی سمجھئے جیسے آجکل سول وار (خانہ جنگی) یا رشتہ داروں کی جنگ ہو جاتی ہے۔ کیا ایسی جنگ

کو حق و صداقت کی جنگ کہا جا سکتا ہے؟

جواب:- مہابھارت کی جنگ ایک خاندانی جھگڑا تھا جو تخت و تاج کے حق کے سوال پر دو شاہی خاندانوں میں برپا ہوا۔ اور اس زمانہ کے آئینِ جنگ و جدل کے مطابق لڑا گیا .... اس زمانہ میں یہ رواج تھا کہ جو لڑائی اس وقت کے آئینِ جنگ کے مطابق لڑی جائے اسے حق و صداقت کی جنگ کہہ دیا جائے۔ یعنی وہ جنگ جو آئین (دھرم) کے مطابق لڑی جائے۔

اس سے بھی آگے بڑھیئے تو مہاتما گاندھی، مہابھارت کے واقعہ کو تاریخی واقعہ ہی تسلیم نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے لکھا تھا:-

میرے خیال میں مہابھارت ایک تمثیل ہے، تاریخ نہیں ہے۔ دروپدی (کے پانچ خاوندوں) سے مراد روح کا حواسِ خمسہ کے ساتھ تمسّک ہے۔ (ہریجن - بابت [illegible])

پنڈت جواہر لال نہرو اس باب میں لکھتے ہیں:-

رامائن اور مہابھارت کا زمانہ تصنیف متعین کرنا مشکل ہے..... (اتنا ظاہر ہے کہ انہیں بہت سے مصنفوں نے لکھا اور بعد میں بہت سے زمانوں میں اضافے ہوتے رہے..... مہابھارت میں ویدوں کی شرک کی تعلیم، اُپ نشدوں کے وحدتِ وجود، مذہبِ فطرت (یعنی خدا پر ایمان لیکن وحی سے انکار) کا مسلک، ثنویت اور توحید ہر قسم کی تعلیم ملتی ہے۔ اس میں گائے اور بچھڑے کے گوشت سے معزز مہمانوں کی تواضع کا تذکرہ بھی ہے۔

(THE DISCOVERY OF INDIA P.81-83)

(۰)

گیتا

مہابھارت میں بھاگوت گیتا بھی شامل ہے۔ گیتا کا تذکرہ آجکل عام طور پر کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب سری کرشن جی مہاراج کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ یعنی یہ مجموعہ ہے ان نصائح کا جو سری کرشن جی مہاراج نے میدانِ کارزار میں ارجن کو کیں۔ لیکن ڈاکٹر داس گپتا کی تحقیق کے مطابق گیتا کوئی مستقل تصنیف نہیں بلکہ اس میں بہت کچھ اُپ نشدوں سے مستعار لیا گیا ہے۔ (داس گپتا، جلد دوم، صفحہ [illegible]) گیتا کے متعلق یہ طے نہیں ہو سکا کہ یہ کس عہد کی تصنیف ہے۔ اور جب زمانۂ تصنیف کا تعین نہیں ہو سکا تو پھر مصنف کے متعلق بھی یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ڈاکٹر داس گپتا کا بیان ہے کہ بھگوت گیتا میں برہم سوتر کا حوالہ موجود ہے۔ اور برہم سوتر دوسری صدی قم کے بعد کی تصنیف قرار دی جا سکتی ہے۔ تحقیق یہ ہے کہ بھگوت گیتا دراصل (EKANTI VAISNARAS) کی تصنیف ہے (داس گپتا، جلد اول، صفحہ ۴۲۱ تا ۴۲۲) اس تحقیق کی رُو سے سری کرشن جی مہاراج کی طرف اس کا انتساب بھی صحیح نہیں رہتا۔ گیتا میں عمل اور حرکت کی تعلیم دی گئی ہے۔ اور یہ اس جمود و تعطل کا ردِ عمل ہے جو یوگ اور ویدانت کے ہندی تصوف کی رُو سے ہندو قوم کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اب ہندو قوم اپنی نشاۃِ ثانیہ کے لئے سری کرشن جی مہاراج ہی کو اپنی زندگی کا نمونہ قرار دے رہی ہے اور گیتا کی تعلیم عام ہو رہی ہے اور دیگر کتبِ مقدسہ (حتیٰ کہ وید بھی) پس پشت ڈالے جا رہے ہیں۔ لیکن سری کرشن جی مہاراج کے متعلق بھی ان کے ہاں عجیب و غریب روایات ہیں۔ ان میں سے ہم صرف ایک روایت درج کرتے ہیں۔ مہابھارت میں ہے:-

وشوامتر، کنوا اور نارد، تینوں رشی دوارکا میں آئے۔ چند نوجوانوں نے ان رشیوں سے اس طرح تمسخر کیا کہ کرشن جی کے ایک بیٹے سانب کو عورت کا لباس پہنا کر ان کے سامنے لائے اور کہا کہ یہ عورت حاملہ ہے۔ آپ بتائیں کہ اس کے پیٹ سے کیا پیدا ہوگا۔ رشیوں نے ناراض ہو کر غصہ کی حالت میں کہا کہ اس سے ایک لوہے کا موسل پیدا ہوگا جس سے جادو بنسی (کرشن جی) کے خاندان کی تباہی ہوگی۔ دوسرے ہی دن سانب سے لوہے کا ایک موسل پیدا ہوا۔ اگرسین نے اپنے خاندان کو اس بربادی سے بچانے کے لئے اس موسل کو تڑوا کر باریک باریک ذرات بنوائے اور ان کو سمندر میں پھینکوا دیا۔ وہ ذرات سمندر کے کنارے آ کر جمع ہو گئے جن سے بکثرت جھاڑ جھنکار پیدا ہو گئے۔ ان ذرات میں ایک لوہے کا ٹکڑا اتفاقاً باریک ہونے سے رہ گیا تھا۔ اس کو ایک مچھلی نگل گئی۔ مچھلی ایک شکاری کے ہاتھ آئی۔ اس کو مچھلی کے پیٹ میں سے لوہے کا ٹکڑا ملا۔ اس نے اس سے تیر کا ایک پیکان بنایا۔ چند روز کے بعد تمام جادو بنسی مع کرشن مہاراج سمندر کے کنارے بغرض سیر و تفریح گئے وہاں سب نے شراب پی، شراب کے نشے میں ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے۔ کرشن جی نے سمندر کے کنارے سے جھاڑ جھنکار اکھیڑ لئے جو ان کے ہاتھ میں آتے ہی ایک موسل کی شکل میں تبدیل ہو گئے۔ کرشن جی نے اس موسل سے باقی ماندہ جادو بنسیوں کو ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد کرشن جی ایک جھاڑی میں جا بیٹھے۔ ان کا جسم درختوں میں بالکل چھپ گیا تھا۔ مگر پاؤں کا ایک تلوا دور سے نظر آتا تھا۔ اتفاقاً وہی مذکورہ شکاری اس طرف کو گزرا اور کرشن جی کے تلوے کو دیکھ کر سمجھا کہ اس جھاڑی میں کوئی ہرن بیٹھا ہے۔ چنانچہ اس نے تاک کر تیر چلایا۔ تیر نشانے پر صحیح بیٹھا اور کرشن جی کا کام تمام ہو گیا۔

(مقدمہ۔ تاریخ ہند قدیم۔ صفحہ ۱۳۷)

باقی رہی سری کرشن جی مہاراج کی تعلیم، آپ کی عملی جد و جہد اور اس کے نتائج، سو اس کے متعلق خود ہندو لیڈروں کی آراء قابلِ غور ہیں۔ اخبار تیج کے کرشن نمبر بابت ستمبر ۱۹۳۹ء میں پنڈت گنگا پرشاد اپادھیائے نے لکھا تھا۔

ویدک دھرم مٹ چکا تھا۔ اس کا صرف نام باقی تھا۔ . . . ایسے وقت میں شری کرشن نے ویدک تہذیب کو نیست و نابود ہونے سے بچانے کے لئے جو جد و جہد کی اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں دوسری نہیں ملتی۔ یہ سچ ہے کہ کرشن جی کو دھرم کے محفوظ رکھنے میں وہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی جو ان کی کوششوں سے مطابقت رکھ سکے۔ جو گراوٹ شری کرشن جی کی زندگی سے پہلے شروع ہوئی وہ اب تک جاری ہے۔

اور سوامی دیانند جی لکھتے ہیں:-

مہابھارت کی جنگ میں نہ صرف آریہ کشتری ہی بلکہ آریہ برہمن بھی بالکل نیست و نابود ہو گئے۔ یہ بات شری کرشن جی کی آخری سوانح عمری سے بھی واضح ہو جاتی ہے . . . . . لیکن آریہ جاتی کے اپنے اندرونی نقص محض جنگی فتح سے دور نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کے لئے تو ایک معقول مدبرانہ علاج کی ضرورت تھی۔ اس وقت ایسا ڈاکٹر آریہ جاتی کو نصیب نہ ہوا، اور شری کرشن جی اپنا کام پورا کئے بغیر ہی اس جہان سے کوچ کر گئے۔ اگر اپنی ابتدائی کوشش یدہشٹر اور دریودھن میں مصالحت پیدا کر سکتی تو وہ ویدک تہذیب کو از سرِ نو قائم کرنے کا تعمیری کام کر سکتے . . . اور مہابھارت کی جنگ اتنی عظیم جنگ ہوئی کہ یدہشٹر کی عالیشان فتح آریہ جاتی کو

اس کی شکست سے بھی زیادہ ہنگی پڑی۔

شری کرشن جی مہاراج کو بھی خدا کا اوتار سمجھ کر ان کی پرستش کی جاتی ہے۔ لیکن اب رفتہ رفتہ انہیں بھی انسان سمجھا جانے لگا ہے۔ ہریجن میں ایک صاحب نے سوال کیا تھا کہ جب جنگ مہابھارت میں کرشن جی نے قسم اٹھائی تھی کہ وہ ہتھیار کا استعمال نہیں کریں گے تو پھر انہوں نے بھیشم کے خلاف سدرشن چکر کیوں چلایا۔ اس کے جواب میں لکھا تھا۔

> اگر قسم توڑنے کا یہ واقعہ صحیح ہے تو اس کا یہی مطلب ہے کہ کرشن جی اتنی بڑی ہستی ہونے کے باوجود انسان ہی تھے اور غلطی کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مہابھارت میں یہ بھی لکھا ہے کہ کرشن جی کی اس فروگذاشت پر بھیشم نے انہیں شرم دلائی اور ان کے شاگرد اور دوست ارجن نے انہیں اس سے بروقت روک دیا۔
>
> (ہریجن۔ بابت ۲۲/۱۲)

گیتا کی تعلیم کے متعلق پنڈت جواہر لال نہرو لکھتے ہیں:۔

> آج ہر فلسفہ اور فکر کے مختلف مدعی گیتا ہی کو اپنی توجہات کا مرکز بنائے ہوئے ہیں اور ہر ایک اپنے اپنے مطلب کے مطابق اس کی تفسیر کر رہا ہے (حتیٰ کہ گاندھی جی (اگر) اپنے عقیدہ اہنسا کی بنیاد گیتا پر رکھتے ہیں تو ایسے لوگ بھی ہیں جو ہنسا (تشدد) اور جنگ کا جواز بھی اسی سے ثابت کرتے ہیں۔
>
> (THE DISCOVERY OF INDIA. P. 83)

(*)

گزشتہ صفحات میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ ہندوؤں کے آستک گروہ سے متعلق ہے جو ویدوں کو مانتا ہے۔ دوسرا گروہ ناستک ہے جو خدا کو مانتا ہے نہ ویدوں کو (لیکن با ایں ہمہ یہ بھی ہندو ہی ہیں) ان میں بدھ اور جین زیادہ مشہور ہیں۔

(باقی)

بقیہ:۔ اس کا سہرا بھی فوج ہی کے سر بندھا

صفحہ ۳۱ سے مسلسل

ہمیں معلوم نہیں کہ قانونی نقطہ نگاہ سے فوجی عدالتوں کے فیصلے عام عدالتوں کے لئے نظائر (PRECEDENTS) کی حیثیت رکھتے ہیں یا نہیں۔ لیکن ایسا ہو یا نہ ہو، ہم ارباب حکومت سے درخواست کریں گے کہ وہ نظریۂ پاکستان کی تشریح کرنے کے بعد اس قسم کا قانون نافذ کریں کہ اس نظریہ کے خلاف اظہار خیال یا کوئی ایسا اقدام جس سے اس کی مخالفت ہوتی ہو، جرم تصور ہوگا اور مستوجب سزا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہوگا کہ پاکستان میں بسنے والے غیر مسلموں کی پوزیشن کو بھی متعین اور واضح کیا جائے کیونکہ نظریہ پاکستان کی رو سے یہ لوگ نہ پاکستانی قوم کے افراد قرار پا سکتے ہیں اور نہ ہی امور مملکت میں شریک کئے جا سکتے۔

(**)

لوٹ کے واویلا کی حقیقت

مشرقی پاکستان کے غدار عناصر نے اپنی باغیانہ اسکیم کو کامیاب بنانے کے لئے جو فضا پیدا کی تھی اس کی بنیاد اس واویلا پر تھی کہ اس تئیس سال کے عرصہ میں مغربی پاکستان مشرقی پاکستان کی دولت لوٹ کر لے گیا ہے اور اس طرح مشرقی پاکستان مغربی پاکستان کی کالونی بن کر رہ گیا ہے۔ یہ ڈھول اس زور سے پیٹا گیا کہ بیرونی ممالک تو ایک طرف خود مغربی پاکستان سے بھی اس قسم کی آوازیں بلند ہونی شروع ہو گئیں کہ مشرقی پاکستان پر واقعی بہت بڑا ظلم ہوا ہے اور تماشہ یہ کہ اس دعویٰ کی تائید میں نہ کسی نے کوئی اعداد و شمار پیش کئے نہ دلائل و براہین۔ ضرورت تھی کہ حکومت کی طرف سے ایک قرطاس ابیض شائع ہوتا جس میں اعداد و شمار کی رو سے حقیقت کو سامنے لایا جاتا۔ افسوس ہے کہ ایسا نہ ہوا۔ البتہ ہمیں دی پنجاب انڈسٹریل ایمپلائرز ایسوسی ایشن (لاہور) کی طرف سے ایک پمفلٹ موصول ہوا ہے جس کا عنوان ہے "پاکستان کی علاقائی معیشی ترقی" اس میں اعداد و شمار کی رو سے ثابت کیا گیا ہے کہ یہ مفروضہ یکسر بے بنیاد ہے کہ مغربی پاکستان نے مشرقی پاکستان کو لوٹ لیا ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ جگہ کی قلت کی وجہ سے ہم اس پورے پمفلٹ کو شائع نہیں کر سکتے۔ اس کا ابتدائی اہم حصہ درج ذیل ہے ـــ واضح رہے کہ یہ پمفلٹ ستمبر ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا تھا۔ یعنی مشرقی پاکستان میں قیامت خیزی سے بہت پہلے۔

(۰)

"یہ کہنا کہ مشرقی پاکستان کی معیشی پسماندگی کو دور کرنے کی کوئی مخلصانہ کوشش نہیں کی گئی قطعاً بے بنیاد الزام ہوگا۔ مندرجہ ذیل جائزے سے اس بات کی وضاحت کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ مسئلہ شروع ہی سے منصوبہ بندی کمیشن کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا اور یہ ایک حقیقت ہے کہ دوسرے پنجسالہ منصوبے کے آخری دور میں مشرقی پاکستان کی ترقی کی رفتار مغربی پاکستان سے کہیں بڑھ گئی تھی۔ بایں ہمہ علاقائی ترقی پر بحث کرتے ہوئے ہمیں دوسرے پنجسالہ منصوبے میں اخذ کردہ نکات کو سامنے رکھنا چاہیئے۔

"تاریخی طور سے مشرقی پاکستان کی معیشی ترقی درحقیقت مغربی پاکستان سے بہت پیچھے رہی ہے۔ برصغیر کی تقسیم کے وقت پاکستان کے ان دو علاقوں میں ترقی کرنے کی صلاحیتیں بالکل مختلف تھیں۔ آزادی کے بعد مختلف وجوہات کی بنا پر مہاجروں کا سرمایہ، ان کی سرمایہ کاری کی صلاحیتیں اور ان کی فنی قابلیت مغربی پاکستان میں مرکوز ہو گئی اور مشرقی پاکستان مہاجر سرمایہ کاروں کے سرمائے کے تجربے سے محروم رہا۔ تاریخ شاہد ہے کہ کسی ترقی پذیر ملک کے تمام علاقوں نے ایک ہی وقت میں یکساں معیشی ترقی حاصل نہیں کی۔ اور یہ ایک

حقیقت ہے کہ معیشتی ترقی کی کوشش کے آغاز میں علاقائی معیشتی تفاوت ہمیشہ بڑھ ہی گیا ہے اور اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ ترقی کے آخری دور میں یہ تفاوت خود بخود کم ہو جاتا ہے۔ کسی ملک کے مختلف علاقوں میں معیشتی تفاوت کوئی انہونی بات نہیں کیونکہ بعض انتہائی ترقی یافتہ ملکوں میں بھی اس ملک کے مختلف علاقوں میں معیشتی تفاوت اس سے کہیں زیادہ ہے جو مشرقی اور مغربی پاکستان میں پایا جاتا ہے۔ ہر دوسرے ملک کی طرح پاکستان میں بھی یہ بات نہایت اہم ہے کہ کم ترقی یافتہ علاقوں میں ترقی کی رفتار کو تیز کیا جائے لیکن ایسا اقدام کرتے وقت یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ کم ترقی یافتہ علاقوں کی ترقی کے خیال میں قومی ترقی کو کسی حالت میں بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔"

(دوسرا پنجسالہ منصوبہ۔ اُنیسواں باب)

برصغیر کی تقسیم کے وقت دونوں صوبوں کی معیشتی حالت کی وضاحت ذیل میں دیئے گئے اعداد و شمار سے بخوبی ہو سکتی ہے۔ اسی گوشوارے میں مشرقی اور مغربی پاکستان کی اس وقت کی معیشتی حالت کے اعداد و شمار دیئے گئے ہیں۔

مغربی پاکستان کے اعداد و شمار میں پنجاب، سرحد اور سندھ کے اعداد و شمار شامل ہیں۔

مشرقی اور مغربی پاکستان کی آمدنی کا گوشوارہ

(کروڑوں میں)

سال	مغربی پاکستان	مشرقی پاکستان
۱۹۴۸-۴۹ء	۲۸٫۰۶	۱۵٫۵۴
۱۹۴۹-۵۰ء	۲۹٫۵۸	۱۲٫۸۲
۱۹۵۴-۵۵ء	۴۳٫۲۵	۱۹٫۸۵

یہ ہے وہ صورتِ حال جس میں آزادی کے فوراً بعد پاکستان کے دونوں صوبوں نے اپنی معیشت کا آغاز کیا۔ ان اعداد و شمار میں مشرقی پاکستان کی معیشتی بدحالی صنعتی شعبے میں خاص طور سے نمایاں ہے۔ برصغیر کی تقسیم کے وقت مشرقی پاکستان کلکتہ اور اس کے قرب و جوار میں قائم شدہ صنعتوں کو صرف خام مال سپلائی کرنے کا ذریعہ تھا۔ اس کے باوجود کہ مشرقی پاکستان کو پٹ سن کی پیداوار میں دنیا میں ایک نمایاں درجہ حاصل تھا، وہاں ایک بھی پٹ سن کی مل قائم نہ تھی۔

آزادی کے فوراً بعد اس وجہ سے کہ اس وقت اہم ضرورت محض قومی معیشت ہی کو بہتر بنانا تھی، پہلے پنجسالہ منصوبے سے پہلے مشرقی پاکستان کی صنعتی ترقی کی طرف کوئی انفرادی توجہ نہیں دی گئی۔ لیکن پہلے پنجسالہ منصوبے ہی میں اس ضرورت کو محسوس کیا گیا کہ مشرقی پاکستان کی صنعتی ترقی کو بہتر بنایا جائے۔ پہلا پنجسالہ منصوبہ جس کی داغ بیل ۱۹۵۵ء میں ڈالی گئی تھی، ۱۹۵۷-۵۸ء ہی میں فعال کارکردگی کا مظاہرہ کر سکا۔ اس منصوبے میں مشرقی پاکستان کے قومی شعبے کے لئے ۲۵۷ کروڑ اور مغربی پاکستان کے لئے ۳۰۱ کروڑ روپیہ مخصوص کیا گیا اور اس منصوبے پر ۱۹۵۷-۵۸ء سے لے کر ۱۹۵۹-۶۰ء تک عمل کیا گیا۔ اسی عرصے میں کراچی کو ۴۵ کروڑ روپے دیئے گئے۔

(پہلا پنجسالہ منصوبہ۔ تیسرا باب)

مشرقی پاکستان کے صنعتی شعبے کی ترقی کے لئے مشرقی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کے ذریعے سے خاص

طور سے کوشش کی گئی اور یہ تجویز پیش کی گئی کہ ۱۹۵۵ء اور ۱۹۶۰ء کے پانچ سالوں میں ۱۶۲۳ر۵۹ کروڑ روپے کے سرمایے میں سے ۹۱۰ر۰۰ کروڑ روپے مشرقی پاکستان میں صرف کئے جائیں۔ (پہلا پنجسالہ منصوبہ ۔ بائیسواں باب)

افسوس ہے کہ چند وجوہات کی بنا پر، جن کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ پہلا پنجسالہ منصوبہ اپنے مقاصد کے حصول میں ناکام رہا۔ لیکن پھر بھی پہلے پنجسالہ منصوبے کے اختتام پر قومی اجتماعی پیداوار میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان وہ فرق باقی نہیں رہا جو پہلے تھا۔ مشرقی پاکستان کی قومی اجتماعی پیداوار ۹۴ر۲ کروڑ تھی اور مغربی پاکستان کی قومی اجتماعی پیداوار ۹۴۷ر۱ کروڑ۔ چند قدرتی سہولتوں کی وجہ سے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، ۵۰۔۱۹۴۹ء اور ۶۰۔۱۹۵۹ء کے دس سالوں میں مغربی پاکستان کی اجتماعی قومی پیداوار میں ۱ر۳ فیصد کا اضافہ ہوا تھا۔ لیکن مشرقی پاکستان میں یہ اضافہ صرف ۹ر۱ فیصد تھا۔ یہ بات انصاف کے خلاف ہوگی، اگر حکومت یہ اعتراف نہ کرے کہ اس عرصے میں حکومت نے ان علاقوں میں جہاں نجی سرمایہ کاری کا فقدان تھا۔ اس کمی کو قومی شعبے میں زیادہ سرمایہ کاری سے پورا کرنے کی کوشش نہیں کی۔

دوسرے پنجسالہ منصوبے میں منصوبہ بندی کمیشن نے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے کم ترقی یافتہ علاقوں کی معیشت کو بہتر بنانا اپنا نصب العین قرار دیا تھا۔ اس بات کے باوجود کہ دوسرے پنجسالہ منصوبے کے دوران مشرقی پاکستان کی آمدنی کا اندازہ صرف ۲۰۷ کروڑ روپیہ لگایا گیا تھا اور اس کے برعکس مغربی پاکستان کی متوقع آمدنی ۳۱۷ کروڑ روپے تھی کمیشن نے یہ فیصلہ کیا کہ دونوں صوبوں کی معیشتی ترقی کے لئے قومی شعبوں میں مشرقی پاکستان کو ۷۲۸ کروڑ روپیہ فراہم کیا جائے اور مغربی پاکستان کو ۵۵۳ کروڑ۔ اور صنعتی شعبوں میں مشرقی پاکستان کو ۹۰ کروڑ اور مغربی پاکستان کو ۴۰ کروڑ روپیہ دیا جائے۔ ان کوششوں کے نتیجے میں دوسرے پنجسالہ منصوبے کے دوران مشرقی پاکستان کی اجتماعی قومی پیداوار میں ۴ر۵ فیصد کا اضافہ ہوا۔ جبکہ مغربی پاکستان میں یہ اضافہ صرف ۵ فیصد رہا۔ مشرقی پاکستان میں فی کس آمدنی کے بڑھنے میں بھی قابلِ قدر اضافہ ہوا۔ پہلے پنجسالہ منصوبے میں مشرقی پاکستان میں فی کس آمدنی کے بڑھنے کی رفتار ۳ر فی صد تھی۔ لیکن دوسرے پنجسالہ منصوبے میں فی کس آمدنی کے بڑھنے میں کافی اضافہ ہوا۔ یعنی یہ اضافہ ۳ر فیصد سے بڑھ کر ۲ر۷ فی صد تک پہنچ گیا۔ جبکہ اسی دوران مغربی پاکستان میں فی کس آمدنی کے بڑھنے کی رفتار صرف ۲ر۴ فیصد تھی۔ ان خوشگوار تبدیلیوں کی وجہ وہ زیادہ حصہ تھا جو حکومتِ پاکستان کے اجتماعی سرمایے سے مشرقی پاکستان کو دیا گیا۔ ۵۰۔۱۹۴۹ء میں مشرقی پاکستان کو ۲۰ فیصد حصہ دیا گیا تھا، ۶۰۔۱۹۵۹ء میں ۳۶ فیصد اور ۶۴۔۱۹۶۳ء میں ۴۷ فیصد۔ ۶۵۔۱۹۶۴ء جاں پہلی دفعہ مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے زیادہ سرمایہ فراہم کیا گیا۔ مشرقی پاکستان کو ۲۰۵ کروڑ روپے دیئے گئے اور اس کے برعکس مغربی پاکستان کے حصے میں ۱۹۵ کروڑ روپے آئے۔ دیہات کے ترقیاتی پروگراموں کے لئے مشرقی پاکستان کو ۴۵ کروڑ روپے دیئے گئے اور مغربی پاکستان کو صرف پندرہ کروڑ روپے۔

تیسرے پنجسالہ منصوبہ میں قومی شعبے کے لئے مشرقی پاکستان کے لئے ۱۶۰۰ کروڑ روپے متعین کئے گئے تھے۔ جبکہ مغربی پاکستان کے لئے صرف ۱۴۰۰ کروڑ روپے منظور ہوئے تھے۔ مشرقی پاکستان کے ۱۶۰۰ کروڑ کا ۱۷ فیصد یعنی ۲۱۰ کروڑ روپے صنعتی شعبے کے لئے مخصوص کئے گئے اور مغربی پاکستان کے ۱۴۰۰ کروڑ روپے کا ۸ر۹ فیصد یعنی ۱۳۷ کروڑ روپے صنعتی شعبے کے لئے مخصوص کئے گئے۔ جہاں تک اس منصوبے پر عملدرآمد کے ذرائع کے اخراجات کا تعلق ہے مشرقی پاکستان میں ۳۰۰ کروڑ روپے صرف ہوتے تھے جبکہ اسی مقصد کے لئے مغربی پاکستان کے لئے ۱۲۳ کروڑ روپے اور مرکز کے لئے ۲۵ کروڑ روپے دیئے گئے تھے۔ نجی

شعبے کے سرمائے کے تعین میں بھی اتنا زیادہ فرق نہیں تھا۔ مشرقی پاکستان کو ۳۰۸ کروڑ روپیہ فراہم کیا گیا تھا اور مغربی پاکستان کو ۴۵۰ کروڑ۔ متعینہ رقوم کے استعمال کے متعلق جو امیدیں قائم کی گئی تھیں۔ وہ مشرقی پاکستان میں پوری نہ ہو سکیں۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ غالباً وہاں سرمایہ جذب کرنے کی اہلیت کی کمی تھی۔ مشرقی پاکستان میں قومی شعبے میں ۱۳۰ کروڑ روپے سے زیادہ سرمایہ استعمال نہ کیا جا سکا۔ فراہم کردہ روپے کو پورے طور سے استعمال نہ کرنے کے باوجود تیسرے پنج سالہ منصوبے کے اخراجات کا ۵۴ فی صد مشرقی پاکستان میں ہی صرف ہوا تھا۔

اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہ ہوگا کہ مشرقی پاکستان کی سرمایہ کاری میں کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۵ء کے درمیان پانچ سالوں میں مشرقی پاکستان کے قومی شعبے کی سرمایہ کاری میں ۲۰.۵ فیصد سالانہ کا اضافہ ہوا جبکہ مغربی پاکستان میں سرمایہ کاری کا یہ سالانہ اضافہ ۱۵.۵ فیصد تھا۔ یہ اعداد و شمار اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ مشرقی پاکستان میں سرمایہ کاری کا شوق پیدا کرنے کے لئے جو کوششیں کی گئیں وہ بار آور ثابت ہوئی ہیں۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۰ء کے درمیان پانچ سالوں میں مشرقی پاکستان کی سرمایہ کاری میں ۴.۸ فیصد سالانہ کا اضافہ ہوا ہے جبکہ مغربی پاکستان میں سرمایہ کاری کا یہ اضافہ صرف ۴.۲ فیصد تھا۔

ترقیاتی منصوبوں میں مشرقی پاکستان کے قومی شعبے میں بڑی بڑی رقموں کا فراہم کرنا اسی صورت میں ہی ممکن ہو سکتا تھا جبکہ مغربی پاکستان کے اخراجات میں کمی کی جائے اور ادھر کا سرمایہ اُدھر منتقل کر دیا جائے۔ دوسرے پنجسالہ منصوبے کے بعد مختلف مالی اقدامات سے مرکزی حکومت ہمیشہ یہ بھرپور کوشش کرتی رہی ہے کہ معاشی ترقی کے تمام وسائل کا رُخ مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان کی طرف موڑ دیا جائے تاکہ مشرقی پاکستان بھی تیزی سے ترقی کر سکے۔ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کے عشرے کے درمیان مشرقی پاکستان کے قومی شعبے میں سرمائے کی فراوانی اس دعوے کی مکمل دلیل ہے۔ چوتھے پنجسالہ منصوبے (۱۹۷۰-۷۵ء) میں مشرقی پاکستان کے قومی شعبے کے لئے ۲۷۹۰ کروڑ روپے کا تعین کیا گیا ہے جبکہ مغربی پاکستان کے قومی شعبے میں ۱۷۴۰ کروڑ روپے دیئے گئے ہیں۔ ان ۲۷۹۰ کروڑ روپے کے علاوہ جن کا تعین مشرقی پاکستان کیلئے کیا گیا ہے، ۱۵۰ کروڑ روپے سیلاب کی روک تھام کیلئے علیحدہ طور پر دیئے گئے ہیں۔ امید کی جا رہی ہے کہ ان بڑی بڑی رقموں کی فراہمی سے مشرقی پاکستان کی سرمایہ کاری میں سالانہ اضافہ ۲۰.۲ فیصد تک پہنچ جائیگا جبکہ مغربی پاکستان میں سرمایہ کاری کا یہ سالانہ اضافہ صرف ۸.۵ فیصد رہیگا۔ جہاں تک ان صنعتی شعبوں کا تعلق ہے جو قومی سرمائے سے چلائے جاتے ہیں، ان کے لئے بھی مشرقی پاکستان کو ۲۳۱ کروڑ روپیہ دیا گیا ہے اور ایسے ہی شعبوں کے لئے مغربی پاکستان کو ۱۲۲ کروڑ روپیہ فراہم کیا گیا ہے۔

مرکزی محصولات میں سے بھی مشرقی پاکستان کو حصہ دیتے وقت کوئی بے انصافی نہیں کی گئی اور مشرقی پاکستان کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اس کو ہمیشہ مغربی پاکستان پر ترجیح دی گئی ہے۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء سے لیکر جون ۱۹۶۲ء تک ان محصولات کی تقسیم رئیسمین ایوارڈ کے ذریعے کی جاتی تھی۔ اس ایوارڈ کے تحت مرکزی محصولات میں سے مغربی پاکستان کو ۲۷.۵ فیصد اور مشرقی پاکستان کو ۲۲.۵ فیصد حصہ ملتا تھا۔ جبکہ حقیقتہً محصولات کی زیادہ تر آمدنی مغربی پاکستان ہی کی محتاج تھی۔ چائے، تمباکو اور چھالیہ سے وصول شدہ محصولات کی تقسیم بھی اسی تناسب سے ہوتی تھی۔ مشرقی پاکستان کو پٹ سن کی آمدنی ۶۲.۵ فیصد بنیادی برآمدی محصول کے علاوہ ۱۰ فیصد زائد محصول بھی ملتا تھا۔ مغربی پاکستان کو بھی روئی کی برآمد سے حاصل شدہ محصولات سے ۶۲.۵ فیصد حصہ ملتا تھا۔ جس صوبے سے جتنا سیلز ٹیکس وصول ہوتا تھا اسکا ۵۰ فیصد اسی صوبے کو دے دیا جاتا تھا۔ اس منصفانہ تقسیم اور حقائق کی روشنی میں نہایت اعتماد سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مغربی پاکستان پر جو الزامات عاید کئے جاتے ہیں۔ وہ سراسر بے بنیاد اور غلط ہیں۔